عالمی ادب سے انتخاب

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط
اور دیگر تراجم

محمد عمر میمن

ISBN:969-8379-76-2

پہلی اشاعت: ۱۹۹۴ء

دوسری اشاعت: ۲۰۰۵ء

زیر اہتمام
آج کی کتابیں

طباعت
ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5650623, 5213916 (92-21)

ای میل: aaj_ki_kitabain@yahoo.com, city_press@email.com

نیر مسعود کے لیے

جو جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

You can forget a face, but can never really wipe out the memory of the warmth of an emotion, the sweetness of a gesture, the sound of a tender voice.
— **Tahar Ben Jalloun,** *The Sacred Night*

ترتیب

❀

میلان کنڈیرا

❁

گم شدہ خطوط

ذیل میں میلان کنڈیرا (Milan Kundera) کے ناول ''خندہ اور فراموشی کی کتاب'' (*The Book of Laughter and Forgetting*) کے چوتھے حصے کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں تمینا نامی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے: تمینا جو بیوہ ہے، بے وطنی میں اپنے دن گزار رہی ہے، جسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے، اور جو کسی قیمت پر اس کی یاد کو زمانے کے ہاتھوں محو ہوتا ہوا دیکھنے کی روادار نہیں۔ انفرادی زندگی میں المیے کا احساس اور اس احساس کی المیہ شدت جن عوامل سے آتی ہے، وہ ہمیں تمینا کی سرگزشت میں ملتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر دو باتیں بہرحال واضح ہو جاتی ہیں: المیے کی اثرانگیزی نہ کرشن چندرانہ فصاحت کی رہینِ منت ہے اور نہ جدید ترین اردو افسانہ نگاروں کی بلند بانگ لفاظی کی۔ وہ تو اس قسم کے بے سنگار، تقریباً برہنہ جملے سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے: ''میں دنیا کو تمینا کے گرد ایک مدور چہاردیواری کی طرح اٹھتا ہوا تصور کرتا ہوں، اور خود تمینا کو بہت نیچے سبزے کی ایک ننھے سے قطعے کی طرح۔ اس قطعے پر پھلنے پھولنے والا واحد گلاب اس کے شوہر کی یاد ہے۔'' دوسرے یہ کہ زندگی کی خوشیوں اور غموں میں شرکت کے لیے منطقی توازن سے مرصّع ذات کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تناقضات سے مبرا ذات کی۔ تمینا کو خوب معلوم ہے کہ جسم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اپنی مجبوریاں۔ ایک دن، چاروناچار، اپنے جسم کی ضرورت سے مغلوب ہو کر اسے کسی غیر مرد کے ساتھ ہم جسم ہونا ہی پڑے گا۔ اور اسے یہ بھی خوب معلوم ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بے وفائی نہ ہوگی۔ یہ سب تو خیر ہے ہی، لیکن غیر مرد کے ساتھ جب ہم بستری کا وقت آتا ہے تو — یہ آپ خود معلوم کیجیے۔ ترجمہ حاضر ہے۔ اور ہو سکے تو پوری کتاب ہی پڑھ جائیے، اور ہم سب عبقریوں کو بے نقط سنائیے، یا بلکہ کنڈیرا کے ہم زبان ہو کر، پورے خلوص اور پورے المیہ احساس کے ساتھ نعرہ لگائیے: ''تمینا اور گیٹے (Goethe) میں وہی فرق ہے جو انسان اور ادیب میں ہوتا ہے۔''

میلان کنڈیرا کا شمار صفِ اول کے ہمعصر مغربی ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ سن ۱۹۲۹ء میں برنو، چیکوسلوواکیہ، میں پیدا ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں جب سوویت یونین نے چیکوسلوواکیہ پر قبضہ کیا تو

اس کے نتیجے میں ملک کے دانشوروں کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ خود کنڈیرا کو بھی: اسے پراگ کے فلمی مدرسے میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا، کام کاج کے دروازے اس پر بند کر دیے گئے، اور اس کی لکھی ہوئی کتابیں کتب خانوں سے اٹھالی گئیں۔ سن ۱۹۷۵ء میں کنڈیرا نے فرانس میں جلاوطنی اختیار کرلی۔ کنڈیرا کی تصانیف میں ایک افسانوں کا مجموعہ، ایک ڈرامہ، اور سات ناول شامل ہیں۔ پہلا ناول ''مذاق'' (The Joke) اور تازہ ترین ''لافانیت'' (Immortality) ہیں۔

—— مترجم

۱

میرے حساب کتاب کے مطابق روئے زمین پر ہر سیکنڈ دو یا تین افسانوی کرداروں کا بپتسمہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب بھی ان بپتسمہ دینے والے یوحناؤں کے جم غفیر میں داخل ہونے کی نوبت آتی ہے، میرا سارا اعتماد لڑکھڑا جاتا ہے۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ مجھے اپنے کرداروں کو کوئی نہ کوئی نام تو بہرحال دینا ہی ہے —— ٹھیک ہے نا؟ لیکن اس بار یہ واضح کر دینے کے لیے کہ میری ہیروئن کا واسطہ مجھ ہی، اور صرف مجھ ہی، سے ہے (اور مجھے اس سے جو انس ہے وہ کبھی کسی اور سے نہیں رہا)، میں اسے جو نام دے رہا ہوں، اس نام کی عورت اس سے پہلے کوئی نہیں ہوئی: تمینا۔ میں اسے دراز قامت، حسین، پینتیس سالہ، اور اصلاً پراگ کی باشندہ تصور کرتا ہوں۔

اس وقت میں اسے یورپ کے مغرب میں ایک صوبائی شہر کی ایک سڑک پر جاتا ہوا دیکھ سکتا ہوں۔ جی ہاں، آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں پراگ کو تو، جو یہاں سے کوسوں دور ہے، اُس کے نام سے پکار رہا ہوں، لیکن اِس شہر کو میں نے گمنام رہنے دیا ہے جو میری کہانی کا محلِ وقوع ہے۔ یہ بات تناظر کے تمام اصولوں کے خلاف جاتی ہے۔ لیکن صاحب، یہ تو اب آپ کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔

تمینا ایک چھوٹے سے کیفے میں ویٹرس کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ یہ کیفے ایک شادی شدہ جوڑے کی ملکیت ہے۔ کیفے سے اتنی کم آمدنی ہوتی تھی کہ شوہر صاحب نے کہیں اور ملازمت کرلی اوران کی جگہ تمینا کو رکھ لیا گیا۔ اپنی نئی جگہ پر جو حقیر تنخواہ شوہر کو ملتی تھی، اوراس سے زیادہ حقیر تنخواہ جو وہ تمینا کو دیتے تھے، تو ان کا فرق ہی بس ان کی واحد نفع بخش آمدنی تھی۔ تمینا گاہکوں کو کافی اور کیل واڈوس[1] لالاکرپیش کرتی ہے (گاہکوں کی تعداد کبھی بھی زیادہ نہیں ہوتی، کیفے ہمیشہ ہی آدھا خالی ہوتا ہے)، اور پھر بار کے کاؤنٹر کے پیچھے واپس چلی جاتی ہے۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف اسٹول پر ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی شخص اس سے گفتگو کا منتظر بیٹھا ہوتا ہے، سارے گاہک اسے پسند کرتے ہیں: وہ بڑی اچھی سامع جو ہے!

لیکن کیا وہ سچ مچ ان کی لن ترانی سنتی بھی ہے؟ یا صرف خاموشی سے، اپنے خیالات میں محو، ان کی طرف دیکھے جاتی ہے؟ یہ میں وثوق سے نہیں بتا سکتا۔ پھر اس کے جان لینے سے کوئی لمبا چوڑا فرق بھی نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ جب دو آدمیوں میں سلسلۂ کلام چل نکلتا ہے تو کس طرح پہلے ایک آدمی مسلسل بات کیے جاتا ہے اور کس طرح دوسرا یہ کہہ کر قطع کلام کرتا ہے،" یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں..." اور پھر اپنے بارے میں رواں ہو جاتا ہے، تا آنکہ اس کے رفیق کو بھی بیچ میں کہیں" یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں..." کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

یہ دونوں" یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں..." بظاہر ایک قسم کا اتفاق ہی معلوم ہوتے ہیں، یعنی طرفین میں سے دوسرے کی بات کو ایک قدم آگے بڑھانے کا ذریعہ۔ لیکن ایسا سوچنا محض خام خیالی ہے۔ اصل میں یہ ایک سفاک قوت کے خلاف اتنی ہی سفاک بیزاری کا اظہار ہوتے ہیں۔ اپنے کان کو غلامی کی بندش سے چھڑانے کی کوشش؛ ایک طرح کا سامنے کا دار جس کا واحد مقصد دوسرے کی قوتِ سامعہ پر حاوی ہو جانا ہوتا ہے۔ خلق و بشر کے درمیان آدمی کی تمام تر زندگی کا مقصد ان کی سماعت پر قابض ہو جانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمینا کی ہر دل عزیزی کا راز صرف اتنا ہے کہ اسے اپنے بارے میں بات چیت کرنے کی ذرا خواہش نہیں۔ اپنی سماعت پر قابض ہونے والی قوتوں کی وہ ادنیٰ سی مزاحمت بھی نہیں کرتی۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتی:" یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں..."

---

[1] Calvados۔ بھوری رنگت کی خشک برانڈی جو سیب کے عرق سے کشید کی جاتی ہے۔

۲

بی بی عمر میں تمینا سے دس سال چھوٹی ہے۔ اِدھر کوئی سال بھر سے وہ تمینا کو اپنے حالات روز کے روز آ کر بتاتی رہی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا (اور سارا کھٹ راگ اس وقت شروع ہوا) جب ایک روز بی بی نے تمینا کو بتایا کہ وہ اور اس کا شوہر آتی گرمیوں میں پراگ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اچانک ایسا لگا گویا تمینا برسوں کی نیند سے چونک پڑی ہو۔ بی بی نے اپنی بات جاری رکھی لیکن (خلاف عادت) تمینا نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا، ''بی بی، اگر واقعی پراگ جانا ہو تو کیا تم میرے والد کے گھر جا کر میرے لیے ایک چیز لا سکتی ہو؟ کوئی بہت بڑی چیز نہیں، بس ایک چھوٹا سا پیکٹ ہے۔ اتنا چھوٹا کہ بہ آسانی تمھارے سوٹ کیس کے ایک گوشے میں آ جائے گا۔''

''ہاں ہاں، ضرور، کوئی بھی چیز،'' بی بی نے کہا، بالکل راضی اور تیار۔

''تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں کتنی ممنون ہوں گی،'' تمینا نے کہا۔

''مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں یہ کام ضرور کر دوں گی،'' بی بی نے کہا۔ دونوں کچھ دیر تک پراگ کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ تمینا کے رخسار جلنے لگے۔

پھر بی بی نے موضوع بدل دیا: ''میں ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔''

تمینا نے چیکوسلوواکیہ میں پڑے ہوئے اپنے پیکٹ کے بارے میں سوچا، اور اس خیال سے کہ اس موقعے پر بی بی سے اس کی دوستی کتنی ناگزیر تھی، اس نے اپنی سماعت ایک بار پھر بی بی کے لیے وقف کر دی۔ ''کتاب؟ کاہے کے بارے میں؟''

بی بی کی یک سالہ بچی ماں کے بار اسٹول کی ٹانگوں کے آس پاس شور مچاتی ہوئی لڑکھڑا رہی تھی۔

''شش!'' بی بی نے گویا فرش کی تہدید کی اور کسی گہرے خیال میں غرق، سگریٹ کا کش لگایا۔

''دنیا کے بارے میں... جس طرح کہ یہ مجھے نظر آتی ہے۔''

بچی اب باقاعدہ چیخنے لگی تھی۔

''سچ مچ کتاب لکھو گی — ہمت ہے؟'' تمینا نے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟'' بی بی نے جواب دیا۔ ایک بار پھر وہ محوِ خیال ہو گئی، پھر بولی، ''ظاہر ہے یہ جاننے

کے لیے کہ کتاب کیسے لکھی جاتی ہے، مجھے دو چار اشاروں کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔ تم بناکا (Banaka) کو تو نہیں جانتیں؟ یا جانتی ہو؟"

"نہیں۔ مگر یہ ذاتِ شریف ہیں کون؟" تمینا نے پوچھا۔

"ایک ادیب ہے،" بی بی نے جواب دیا۔ "یہیں آس پاس کہیں رہتا ہے۔ میرے لیے اس سے ملنا اشد ضروری ہے۔"

"کیا لکھا ہے اس نے؟"

"مجھے نہیں معلوم،" بی بی نے کہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے یہ اضافہ کر دیا، "اچھا ہوگا کہ میں پہلے اس کی لکھی ہوئی کوئی چیز پڑھ ڈالوں۔"

۳

ٹیلیفون کے رسیور سے جو کچھ برآمد ہوا، وہ احساسِ مسرت سے لبریز کوئی فجائی فقرہ یا تحیر کہ جس کی وہ توقع کر سکتی ہو، نہ تھا، بلکہ ایک سرد مہر "او تم، اچھا۔ اتنے سالوں بعد یاد کیا۔"

"تمھیں پتا ہے کہ میری مالی حالت اچھی نہیں،" تمینا نے اعتذاراً کہا، "فون کرنے میں بہت پیسے لگ جاتے ہیں۔"

"تو خط لکھ دیا ہوتا۔ ٹکٹ پر تو اتنے پیسے خرچ نہیں ہوتے — یا ہوتے ہیں؟ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمھارا آخری خط کب آیا تھا۔"

اس خیال سے کہ شروعات ہی غلط طرح سے ہو گئی ہے، تمینا کچھ دب سی گئی اور اپنی ساس کی مزاج پرسی کرنے لگی۔ جب یہ تمام تکلفات پورے ہو گئے، تب کہیں جا کر حرفِ مدعا زبان پر لائی:

"ایک کام آن پڑا ہے۔ کر دو تو بے حد شکر گذار ہوں گی۔ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو پیچھے ایک چھوٹا سا پیکٹ چھوڑ آئے تھے۔"

"پیکٹ؟"

"ہاں۔ تم نے اور می ریک (Mirek) نے مل کر اسے والد صاحب کے ڈیسک میں مقفل کر دیا تھا۔ اس کی ایک دراز می ریک کے لیے وقف تھی — یاد ہے؟ اور می ریک نے چابی تمھارے حوالے کر

دی تھی۔"

"چابی؟ مجھے کوئی چابی وابی یادنہیں۔"

"مگراماں، چابی تمھارے پاس ضرور ہونی چاہیے! می ریک نے تمھیں دی تھی، میرے سامنے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"تم لوگوں نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔"

"بہت زمانہ ہوگیا ہے۔ ممکن ہے تم بھول بھال گئی ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ ذرا ڈھونڈ ڈھانڈ کر چابی دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ ڈھونڈو گی تو ضرور مل جائے گی۔"

"اور مل گئی تو پھر کیا؟"

"ذرا دراز کھول کر اطمینان کر لینا کہ وہ پیکٹ وہاں اب بھی موجود ہے۔"

تو کیا تمھارے خیال میں اس کے پر لگ گئے ہوں گے؟ تم نے خود اسے وہاں رکھا تھا ـــــ نہیں؟"

"ہاں۔"

"تو پھر مجھے دراز کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمھارا کیا خیال ہے، میں تمھاری نوٹ بکس الٹ پلٹ کرتی رہی ہوں؟"

تمینا دنگ رہ گئی۔ اس کی ساس کو کیسے پتا چلا کہ دراز میں نوٹ بکس تھیں؟ اس نے انھیں حفاظت سے کاغذ میں لپیٹ کر اوپر سے گوند والی ٹیپ لگا دی تھی۔ الغرض اس نے ساس پر اپنی حیرت ذرا ظاہر نہ ہونے دی۔ "نہیں نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم ذرا دیکھ کر اطمینان کر لو کہ یہ وہاں موجود ہیں۔ اگلی دفعہ جب فون کرلوں گی تو پھر کچھ اور بتاؤں گی۔"

"اس وقت بتانے میں کیا بگڑ جائے گا؟"

"میں زیادہ دیر فون پر بات نہیں کر سکتی اماں، بہت پیسے لگ جائیں گے۔"

"تو پھر فون کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" بڑی بی نے دھڑ دھڑ آنسو بہانے شروع کر دیے۔

"اماں، روؤمت،" تمینا نے التجا کی۔ اپنی ساس کا رونا اسے خوب یاد تھا۔ جب کبھی بڑی بی ان دونوں سے کچھ اینٹھنا چاہتیں، ساون بھادوں کی جھڑی لگا دیتیں۔ یہ ان دونوں پر الزام تراشی کا بے حد جارحانہ حربہ تھا۔

ریسیور اس کی ہچکیوں سے تھرتھرانے لگا۔ ''خدا حافظ، اماں،'' تمینا نے کہا، ''جلد ہی دوبارہ فون کروں گی۔''

تاہم تمینا کی ہمت نہ ہوئی کہ بڑی بی کے رونا بند کرنے اور خدا حافظ کہنے سے پہلے فون منقطع کر دے۔ لیکن آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، اور ہر آنسو فون کی قیمت میں بھاری اضافہ کیے جا رہا تھا۔

چنانچہ تمینا نے کھٹ سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''یہ تو شیطان کی آنت جتنی لمبی کال کر ڈالی تم نے،'' تمینا کے آقا کی بیوی نے وقت کا میزان رکھنے والے آلے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سوگوار آواز میں کہا، پھر چیکوسلوواکیہ کے ریٹ سے اس نے کال کی مدتِ وقت کو ضرب دیا، اور تمینا کال کی قیمت دیکھ کر خاصی وحشت زدہ ہو گئی، تاہم اس نے بغیر آنا کانی کیے پوری رقم چٹ پٹ ادا کر دی۔

۴

تمینا اور اس کا شوہر چیکوسلوواکیہ سے غیر قانونی طور پر نکلے تھے۔ ترکیب یہ کی کہ حکومتی ٹریول ایجنسی میں اپنا نام اس گروہ میں لکھوایا جو یوگوسلاویہ کے ساحلی علاقے کی سیر و سیاحت کو جانا چاہتا تھا۔ اور جب وہاں پہنچ گئے تو گروہ سے کٹ کر آسٹریا ہوتے ہوئے مغرب چلے آئے۔

لوگوں کو مشتبہ نظر آنے سے بچنے کے لیے دونوں نے صرف ایک بڑا سوٹ کیس ہی ساتھ لیا تھا۔ لیکن ٹھیک آخری لمحے میں ان کی ہمت جواب دے گئی اور انھوں نے وہ پیکٹ وہیں چھوڑ دیا جس میں ان کے ایک دوسرے کے نام خطوط اور تمینا کی نوٹ بکس تھیں۔ کسٹم کے معائنے کے دوران ان کے مقبوضہ ملک کے کسی افسر نے اگر ان کا سوٹ کیس کھول کر تلاشی لینی شروع کر دی ہوتی تو اس بنڈل کو دیکھ کر اس کا ماتھا ضرور ٹھنکتا: ساحل سمندر پر صرف دو ہفتے کی چھٹی منانے کے لیے کون ہوش مند اپنی نجی زندگی کا سارا دفتر ساتھ اٹھائے پھرتا ہے؟ چونکہ وہ اس بنڈل کو اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، کہ انھیں خوب معلوم تھا کہ فرار ہوتے ہی حکومت ان کا اپارٹمنٹ اپنی تحویل میں لے لے گی، انھوں نے پراگ سے باہر تمینا کی ساس کے اپارٹمنٹ میں، تمینا کے مرحوم خسر کی قدیم اور غیر مستعمل ڈیسک میں اسے سینت کر رکھ دیا۔

بیرونِ ملک تمینا کا شوہر سخت بیمار پڑ گیا۔ تمینا صرف اتنا ہی کر سکی کہ بیٹھی موت کے ہاتھوں اسے آہستہ آہستہ فنا ہوتا دیکھتی رہے۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ لاش کو دفنایا جائے یا جلایا؟ اس نے جلانے کو کہہ دیا۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ اس کی خاک کو خاکدان میں محفوظ رکھنے کے حق میں ہے یا منتشر کر دینے کے؟ اس خیال سے کہ اس کا ذاتی گھر تو ہے نہیں، اور وہ دستی سامان کی طرح اپنے شوہر کو ہر جگہ اٹھائے پھرنے پر مجبور ہو جائے گی، تمینا نے اس کی خاک منتشر کرادی۔

میں دنیا کو تمینا کے گرد ایک مدوّر چہار دیواری کی طرح اٹھتا ہوا تصور کرتا ہوں، اور خود تمینا کو بہت نیچے سبزے کے ایک ننھے سے قطعے کی طرح۔ اس قطعے پر پھلنے پھولنے والا واحد گلاب اس کے شوہر کی یاد ہے۔

یا پھر میں تمینا کے حال کا (جو لوگوں کو قہوے کے پیالے پیش کرنے اور ان کی لن ترانیوں کو بہ کمالِ خاموشی سننے سے عبارت ہے) اس طرح تصور کرتا ہوں جیسے لٹھوں کا کوئی ٹھاٹھہ سطحِ آب پر بہا جا رہا ہو، جس پر بیٹھی وہ پیچھے کی طرف دیکھے جا رہی ہو، صرف پیچھے کی طرف۔

ان دنوں وہ بڑی حسرت سے یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ ماضی آہستہ آہستہ دھندلا کر اس کی پہنچ سے نکلا جا رہا ہے۔ اپنے شوہر کی باقیات میں اس کے پاس صرف ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر رہ گئی ہے۔ بقیہ تمام تصاویر وہیں پراگ والے اپارٹمنٹ میں رہ گئی ہیں، جس پر اب حکومت نے قبضہ کر لیا ہوگا۔ ہر روز وہ اس میلی کچیلی تصویر کو دیکھتی ہے جس کے کونے دستبردِ زمانہ سے تڑ مڑ گئے ہیں۔ اس میں اس کے شوہر کا پورا چہرہ دکھایا گیا ہے (جس طرح کسی مجرم کی تصویر میں ہوتا ہے)۔ شباہت بھی کچھ اتنی واضح نہیں۔ وہ ہر روز تھوڑا سا وقت ایک قسم کی روحانی ریاضت میں گزارتی ہے۔ یہ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ یک رخی خاکے (profile) میں کیسا لگتا، پھر نصف، اور پھر ایک چوتھائی یک رخی خاکے میں۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی کے خط کا معائنہ کرتی ہے۔ روز ہی نئے نئے مبہم اور غیر واضح دھبوں کو دیکھ کر، جن تک پہنچ کر اس کا حافظہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور طے نہیں کر پاتا کہ آگے کس سمت میں جائے، مارے دہشت کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کی مشقوں کے درمیان وہ اس کی جلد کو مع اس کی رنگت، اس کے معمولی نقائص، مثلاً مہین مہین مسّے، گومڑیاں، رگیں، جھائیاں، تصور میں ابھارنے کی کوشش کرتی، لیکن یہ مشکل، بلکہ تقریباً

ناممکن ثابت ہوتا۔ اس کا حافظہ جن رنگوں کا استعمال کرتا، تمام غیر حقیقی ہوتے، اور انسانی جلد کے صحیح رنگ کے ساتھ انصاف نہ کر پاتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے شوہر کی تخیلی بازیافت کا ایک بہت ذاتی اور منفرد طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ جب بھی وہ کسی مرد کے آمنے سامنے بیٹھتی تو اس کے سر کو سنگتراش کے armature کے طور پر استعمال کرتی۔ اپنی تمام تر قوتِ ارتکاز کو کام میں لا کے اس آدمی کے چہرے کو اپنے ذہن میں نئے سرے سے ڈھالتی، جلد کے رنگ کو قدرے گہرا کر دیتی، اس پر مسوں اور چھائیوں کا اضافہ کر دیتی، کانوں کی آہستہ آہستہ تراش خراش کرتی اور آنکھوں کو نیلا رنگ دیتی۔

لیکن ان تمام کوششوں سے اگر کچھ ثابت ہوتا تھا تو بس یہ کہ اس کے خاوند کا عکس ہمیشہ کے لیے محو ہو چکا ہے۔ جن دنوں انھوں نے ابھی ابھی ڈیٹنگ شروع کی تھی، اس نے تمینا سے کہا تھا کہ وہ باقاعدہ ڈائری لکھا کرے اور اس میں دونوں ہی کی زندگی کا حساب کتاب رکھا کرے۔ (وہ عمر میں تمینا سے دس سال بڑا تھا اور انسانی حافظے کی کمزوری کا اسے بہر حال کچھ اندازہ ضرور تھا۔) اول اول تمینا نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، یہ تو ان کی محبت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہوا۔ اسے اپنے شوہر سے اتنی شدید محبت تھی کہ وہ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ چیز جسے وہ ناقابلِ فراموش سمجھتی ہے، کبھی فراموش بھی ہو سکتی ہے۔ آخر میں، بہر حال، اس نے وہی کیا جو اس کا شوہر چاہتا تھا۔ یوں اس نے ڈائری لکھنا شروع تو کر دی، لیکن تحریر میں جوش اور ولولہ پیدا نہ کر سکی۔ اور یہ بات ان نوٹ بکس سے صاف ظاہر ہو جاتی تھی۔ ان میں جگہ جگہ کئی کئی صفحے خالی تھے۔ پھر اندراجات بھی خاصے شکستہ اور نامکمل۔

۵

اس نے بوہیمیا (Bohemia) میں پورے گیارہ سال اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے، اور پیچھے پوری گیارہ نوٹ بکس اس کی ساس کے قبضے میں پڑی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے فوراً بعد اس نے ایک نوٹ بک خریدی اور اسے گیارہ حصوں میں تقسیم کیا۔ گو وہ کئی نیم فراموش کردہ واقعات اور صورت حالات کو ازسرِنو شکل دینے میں کامیاب ہو گئی تھی، لیکن یہ بالکل معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں درج کرے تو کس حصے میں۔ واقعات کی زمانی ترتیب کا سارا احساس زائل ہو چکا تھا۔

چنانچہ اس نے سب سے پہلے جس کام کا بیڑا اٹھایا وہ یادوں کی بازیافت تھا، تاکہ وقت کے بہاؤ

میں ان سے ایک ریفیرینس پوائنٹ کا کام لیا جا سکے اور یوں وہ ماضی کو دوبارہ تخلیق کرنے میں ایک بنیادی ڈھانچے کی طرح ثابت ہوں۔ مثال کے طور پر، وہ چھٹیاں جو انھوں نے منائی تھیں، انھیں تعداد میں گیارہ ہونا چاہیے۔ لیکن وہ ان میں سے صرف نو ہی یاد کر سکی۔ بقیہ دو حافظے سے اس طرح گم ہو چکی تھیں کہ بازیافت ناممکن تھی۔

ان نو، از سرِ نو تخلیق کردہ، تعطیلات میں سے ہر ایک کو اس نے اپنی نوٹ بک کے گیارہ حصوں میں جدا جدا درج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے اس پر مکمل اعتماد اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب اس سال کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہو۔ ۱۹۶۴ء میں تمینا کی ماں کا انتقال ہوا تھا اور معمول سے ایک ماہ بعد ان دونوں نے چند سوگوار تعطیلی ہفتے تترس (Tatras) میں گزارے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سے اگلے سال وہ ساحلِ آب کی تفریح کے لیے بلغاریہ گئے تھے۔ اسے ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء والی تعطیلات بھی یاد تھیں کیونکہ یہ چیکوسلوواکیہ میں ان کی آخری چھٹیاں تھیں۔

(زمانی ترتیب برطرف،) اگر بیشتر چھٹیوں کو از سرِ نو تخلیق کرنے میں اسے بہتر کامیابی ہو بھی گئی تو کرسمس اور نئے سال کے موقعے بالکل قابو میں نہ آ سکے۔ گیارہ میں سے صرف دو کرسمس اور بارہ نئے سالوں میں سے صرف پانچ ہی اسے یاد آ سکے۔

اس نے ان پیار کے ناموں کو یاد کرنے کی کوشش بھی کی جن سے اُس نے اِسے مختلف اوقات میں پکارا تھا۔ تمینا کے اصلی نام کو اس نے صرف شادی کے بعد کے دو ایک ہفتوں ہی تک استعمال کیا تھا۔ اس کی شفقت اور نرمی اس مشین کی طرح تھی جس سے پیار کے نت نئے نام ڈھلے ڈھلائے نکلے چلے آتے تھے اور اس سے پہلے کہ ان میں کا کوئی نام پیش پا افتادہ ہو جائے، وہ بڑی پھرتی سے ایک اور نیا نام وضع کر لیا کرتا تھا۔ ان بارہ برسوں میں جو دونوں نے ساتھ گزارے تھے، اس نے بیس تیس نام تو کم از کم اسے ضرور دے ڈالے ہوں گے۔ ان سے ہر ایک کا تعلق ان کی زندگی کے ایک خاص اور معینہ دور سے تھا۔

لیکن وہ اس گمشدہ کڑی کو کیسے بحال کر سکتی تھی جو پیار کے کسی مخصوص نام اور وقت کے بہاؤ کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہو؟ یہ کامیابی تو بہت نایاب موقعوں ہی پر ہو سکی۔ مثلاً وہ اپنی ماں کی وفات کے بعد والے دن یاد کر سکتی تھی جب اس کے شوہر نے بالکل قریب آ کر، جیسے اسے کسی خواب سے بیدار

کرنے کی کوشش کر رہا ہو، بڑے تعمیل طلب انداز میں اس کا نام سرگوشیوں میں لیا تھا (اس کا وہ نام جو اس نے اسے اُن دنوں دے رکھا تھا)؛ ہاں، تو یہ نام اسے خوب یاد تھا۔ وہ اسے نہایت اعتماد کے ساتھ ۱۹۶۴ء کے تحت درج بھی کر سکتی تھی۔ لیکن بقیہ دوسرے نام چڑیا گھر سے مفرور پرندوں کی طرح، بہ کمال آزادی وجنوں، وقت کے باہر اڑتے پھر رہے تھے۔

یہی وجہ ہے جو وہ اس شدید وارفتگی سے نوٹ بکس اور خطوں کے اس بنڈل کی بازیافت کی خواہاں ہے۔

ظاہر ہے وہ خوب جانتی ہے کہ ان نوٹ بکس میں بہت سی ناخوشگوار باتیں بھی درج ہیں۔ ناآسودگی کے دن، ازدواجی چپقلشیں، حتیٰ کہ اکتاہٹ اور بیزاری بھی۔ تاہم یہ چیزیں بے حیثیت ہیں۔ اس نے کب یہ چاہا ہے کہ ماضی شعر میں بدل جائے۔ وہ تو اس بات کی کوشاں ہے کہ ماضی کو اس کا گمشدہ جسم لوٹا دے۔ اس جذبے کا محرک خواہشِ حسن نہیں، بلکہ آرزوئے حیات ہے۔

سو دیکھیے، وہ وہاں لٹھوں کے ٹھاٹھے پر بیٹھی ہوئی پیچھے کی طرف دیکھے جا رہی ہے، صرف پیچھے کی طرف۔ اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے زیادہ نہیں جو اسے فاصلے میں نظر آ رہا ہے۔ جوں جوں اس کا ماضی سمٹتا، غائب ہوتا، اور پارہ پارہ ہوتا جاتا ہے، خود تمینا بھی اسی تناسب سے سمٹنا اور دھندلانا شروع کر دیتی ہے۔

وہ ان نوٹ بکس کو دیکھنے کو اس لیے تڑپ رہی ہے کہ ان کی مدد سے اس نئی نوٹ بک میں واقعات کے خستہ حال ڈھانچے کو مکمل کر سکے، اس کو در و دیوار سے آراستہ کر سکے، اور یوں اس کا ایک گھر بنا دے جس میں رہ سکے۔ کیونکہ ایک بری طرح نصب کیے ہوئے خیمے کی طرح اگر اس کی یادوں کا مرتعش ڈھانچا نیچے آ رہا تو پھر تمینا کے پاس حال کے سوا کچھ باقی نہ بچے گا ــــ وہ حال جو ایک غیر مرئی نقطے کی طرح ہے، اور موت کی طرف آہستہ خرام کوئی لاشے۔

۶

تو پھر کیوں اس نے اپنی ساس سے پیکٹ بھیج دینے کی درخواست کرنے میں اتنی دیر لگا دی؟ چیکوسلوواکیہ سے باہر جانے والی ساری ڈاک خفیہ پولیس کے ہاتھوں سے ہو کر ہی جاتی تھی۔

تمینا اس بات پر کبھی راضی نہ ہوسکی کہ پولیس والے اس کے بے حد نجی معاملات میں دخیل ہوں۔ پھر یہ بھی کہ اس کے شوہر کا نام (جو ہنوز اس کا اپنا نام بھی تھا) اب بھی بلیک لسٹ پر چڑھا ہوا ہوگا، اور پولیس والے ہمیشہ ایسے شواہد اور دستاویزات کے متلاشی رہتے ہیں جن کا تعلق ان کے مخالفین کی زندگیوں سے ہو، حتیٰ کہ ایسے مخالفین سے بھی جو کب کے مرکھپ چکے ہوں۔ (تمینا اس معاملے میں غلطی پر نہ تھی: پولیس کی مِسلوں پر ہی ہم اپنے جاوداں ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔)

بہ الفاظِ دیگر، اس کی رہی سہی امید بس اب بی بی ہی سے وابستہ ہے۔ اور بی بی سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ بی بی بنا کا سے ملنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اسے بنا کا کی کتابوں میں سے کم از کم ایک کتاب کے پلاٹ سے تو ضرور واقف ہونا چاہیے، یہ تمینا کا خیال ہے۔ کبھی دورانِ گفتگو اسے اس قسم کے خیال کا اظہار کرنا چاہیے: ''بالکل ٹھیک۔ اس سے ملتی جلتی بات تم نے فلاں کتاب میں کہی ہے!'' یا: ''جانتے ہو، تم عین مین اپنے کرداروں کی طرح ہو!'' تمینا کو خوب معلوم ہے کہ بی بی کے اپارٹمنٹ میں کہیں ایک کتاب کا وجود نہیں۔ یہی نہیں، پڑھنا پڑ جائے تو مارے بوریت کے بی بی کے آنسو نکل آتے ہیں۔ چنانچہ تمینا کو لازم آتا ہے کہ خود معلوم کرے کہ بنا کا کن موضوعات پر لکھتا ہے، اور بی بی کو اس سے گفتگو کے واسطے باقاعدہ تیار کرے۔

ممکن ہے ہیوگو کو، جو کیفے کے باقاعدہ گاہکوں میں سے ہے، کچھ سن گن ہو۔ ''تم بنا کا کو جانتے ہو؟'' تمینا نے کافی کا پیالہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

ہیوگو کے منہ سے ہمیشہ بدبو آیا کرتی تھی۔ ورنہ بقیہ اعتبارات سے تمینا اسے کافی گوارا عادت پاتی تھی: خاموش طبع، شرمیلا، عمر میں تمینا سے پانچ سات سال چھوٹا۔ وہ ہفتے میں ایک بار کیفے آتا۔ یہاں اس کا مشغلہ باری باری ندیدی نظروں سے ان کتابوں کو جو وہ اپنے ساتھ لاتا تھا اور اتنی ہی ندیدی نظروں سے کاؤنٹر کے پیچھے ایستادہ تمینا کو دیکھنا ہوتا تھا۔

''ہاں، میں اسے جانتا ہوں،'' اس نے جواب دیا۔

''اس کی کسی کتاب کا موضوع بتا سکتے ہو؟''

''دیکھو تمینا،'' ہیوگو نے کہا، ''آج تک کسی نے — اور میں تاکیداً کہتا ہوں، کسی نے — اس کی لکھی ہوئی کوئی چیز نہیں پڑھی ہے، یا کم از کم یہ اعتراف نہیں کیا کہ پڑھی ہے۔ وہ دوسرے، تیسرے،

بلکہ یوں کہو کہ دسویں درجے کا ادیب ہے۔ سب جانتے ہیں۔ اس کی شہرت صفر کے برابر ہے۔ چنانچہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے اس کے پاس سوائے حقارت کے اور کوئی چیز نہیں۔"

تمینا نے بنا کا کی لکھی ہوئی کتابوں کو حاصل کرنے کی جستجو چھوڑ دی، تاہم بی بی کو اس سے ملوانے کو وہ اب بھی اپنی ذمے داری سمجھتی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنے اپارٹمنٹ کو، جو سارا دن خالی پڑا رہتا تھا، یویو (Joujou) نامی ایک نوجوان، شادی شدہ، جاپانی لڑکی کو فلسفے کے ایک پروفیسر کے ساتھ، جو خیر سے خود بھی شادی شدہ تھا، اپنی خفیہ عاشقانہ ملاقات کے لیے استعمال کرنے دیتی تھی۔ یہ پروفیسر بنا کا سے واقف تھا، اور تمینا نے عاشقوں کی اس جوڑی سے وعدہ کرا کے چھوڑا کہ ایک ایسے دن جب بی بی یہاں موجود ہو، وہ بنا کا کو گھیر گھار کے یہاں لے آئیں گے۔

جب بی بی کو اس بات کا پتا چلا تو اس کا ردِّعمل یہ تھا: ''ہوسکتا ہے کہ یہ بنا کا خاصا حسین آدمی نکلے، اور تمھاری جنسی خشک سالی کے دن پورے ہوں۔"

۷

بالکل درست۔ شوہر کی وفات کے بعد سے آج تک تمینا کسی مرد کے ساتھ نہیں سوئی تھی۔ یہ کسی اصول کی پابندی کی بنا پر نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنی یہ جنسی وفاداری، جو قبر کے ماورا بھی قائم تھی، خاصی مہمل نظر آتی، اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے اس بارے میں کبھی ڈینگ بھی نہیں ماری تھی۔ تاہم وہ جب بھی کسی مرد کے سامنے اپنے برہنہ ہونے کا تصور کرتی (اور یہ تصور وہ اکثر کیا کرتی) تو اس کے شوہر کا پیکر یکلخت اس کی نظروں کے سامنے تیر جاتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ ہم جسی کے دوران وہ اسے مستقل دکھائی دیتا رہے گا۔ اسے پتا تھا کہ اسے اُس کا چہرہ نظر آتا رہے گا، اور اُس کی اپنے پر ثبت آنکھیں بھی۔

ظاہر ہے یہ بڑی بے ڈھب بات تھی، بالکل احمقانہ، اور اس سے مخفی بھی نہیں۔ اس کے شوہر کی روح مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گی، اس بات پر اس کا عقیدہ نہ تھا۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک آدھ عاشق ڈھونڈ نکالا تو اس بات سے اس کے شوہر کی یاد کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس کے باوجود وہ اس معاملے میں بالکل بے بس تھی۔

یہ ذرا عجیب تو بے شک لگے گا تاہم اسے یہ خیال بھی آتا کہ اگر وہ اپنے شوہر کی زندگی ہی میں کسی اور مرد کے ساتھ سوئی ہوتی تو آج کسی کے ساتھ ہم بستری کہیں آسان ثابت ہوتی۔ اس کا شوہر ایک مطمئن، کامیاب، اور گرم جوش آدمی تھا، اور تمینا نے مقابلتاً خود کو ہمیشہ ہی کمزور محسوس کیا تھا۔ اسے ہمیشہ یہی لگتا کہ اگر وہ چاہے تو بھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس سے اس کے شوہر کی دل آزاری ہو۔

لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ اب اگر کوئی ایسا قدم اٹھائے تو وہ اس سے ایک ایسے شخص کو ایذا پہنچائے گی جو پلٹ کر اس کا مقابلہ کرنے سے معذور ہے، جو اَب اس کا اتنا ہی دست نگر ہے جتنا ایک بچہ ہوتا ہے۔ پوری کائنات میں اب صرف وہی اپنے مرحوم شوہر کی رہ گئی تھی —— صرف وہی!

یہی وجہ تھی کہ جس لمحے کسی غیر مرد کے ساتھ جسمانی محبت کے امکان کا خیال اسے بھولے سے بھی آتا، اس کے شوہر کا پیکر اس کے سامنے آ دھمکتا، اور ساتھ ہی اس کے لیے بے پناہ خواہش، اور خواہش کے ساتھ رو دینے کی پُرزور تڑپ۔

۸

بنا کا بدشکل آدمی تھا —— اس قسم کا آدمی نہیں جو عورت کی خوابیدہ شہوانیت کو جگا سکے۔ تمینا نے اسے چائے پیش کی اور اس نے بڑے احترام سے شکریہ ادا کیا۔ گفتگو کا کوئی خاص مرکز نہ تھا، اور سبھی اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک بنا کا مڑا اور مسکرا کر بی بی سے بولا، ''سننے میں آ رہا ہے کہ تم کوئی کتاب وتاب لکھنے والی ہو۔ کاہے کے بارے میں ہوگی؟''

''بس،'' بی بی نے کہا، ''ایک ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ جس طرح مجھے دنیا نظر آتی ہے، اُس کے بارے میں۔''

''ناول؟'' بنا کا کے استفسار میں ناپسندیدگی کا شائبہ تھا۔

''کوئی ضروری نہیں ناول ہی ہو،'' بی بی نے جواباً کہا، یوں جیسے اچانک اپنے بارے میں شک میں پڑ گئی ہو۔

''کبھی سوچا بھی ہے کہ ناول میں کیا کچھ کاٹھ کباڑ ڈالنا پڑتا ہے؟'' اس نے کہا، ''مثلاً اب وہ بھانت بھانت کے کردار ہی لے لو۔ تو کیا ان کرداروں کے بارے میں تم سب کچھ جانتی ہو؟ وہ کیسے

دکھائی دیتے ہیں؟ کیسے سوچتے ہیں؟ کس قسم کے کپڑے پہنتے ہیں؟ کس ماحول سے آئے ہیں؟ تمھیں ان باتوں سے بھلا کیا لینا دینا، کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل،'' بی بی نے فوراً مان لیا۔ ''مجھے ان باتوں کی مطلق پروا نہیں۔''

جانتی ہو،'' وہ اپنی ہانکے گیا،'' ناول اس انسانی فریبِ نظر کا ثمر ہوتے ہیں جس کی رو سے ہم اپنے بھائی بندوں کو سمجھنے کے مدعی ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں!''

''کچھ بھی نہیں،'' بی بی نے کہا۔

''بالکل سچ ہے،'' یو یو نے ٹکڑا لگایا۔

فلسفے کے پروفیسر صاحب نے سر ہلا کر تائید کی۔

''ہم صرف یہ کر سکتے ہیں،'' بنا کا نے کہا،'' کہ خود اپنی ذات کا کچا چٹھا پیش کر دیں۔ اس کے علاوہ ہر شے طاقت کا غلط استعمال ہی ٹھہرے گی۔ اس کے علاوہ ہر چیز جھوٹ ہے۔''

''سچ، بالکل سچ!'' بی بی نے پرجوش اعتراف کیا،'' میں ناول نہیں لکھنا چاہتی۔ لکھنے سے میرا مطلب یہ تھا بھی نہیں۔ میرا مطلب تو من وعن وہی تھا جو آپ نے ابھی ابھی بیان کیا ہے۔ یعنی انکشافِ ذات۔ اپنی زندگی کا حساب دینا۔ اور میں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کروں گی کہ میری زندگی بڑی معمولی ہے، مجھے کبھی کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔''

بنا کا مسکرایا۔'' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے دیکھو۔ باہر سے دیکھو تو خود مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہا!'' بی بی نے نعرہ لگایا،'' بالکل ٹھیک! مجھے باہر سے دیکھو۔ مجھ میں سرخاب کے کوئی پر نہیں لگے ہیں۔ باہر سے! کیونکہ میرے اندر جو کچھ ہو رہا ہے، اندرونی طور پر، لکھنے لکھانے کے قابل تو اصل میں وہی ہے۔ اور لوگ بھی اسی کو پڑھنا چاہیں گے۔''

دریں اثنا، تمینا ان کی خالی ہوتی ہوئی پیالیوں میں مسلسل چائے ڈالتی رہی۔ وہ خوش تھی کہ یہ دونوں مرد، جو ذہن کے کوہِ اولمپس سے اس کے اپارٹمنٹ میں قدم رنجہ ہوئے تھے، اس کی سہیلی کے ساتھ اچھا سلوک کر رہے تھے۔

فلسفے کے پروفیسر نے اپنے پائپ کا لمبا سا کش لیا اور دھویں کے پیچھے چھپ گیا، یوں جیسے اپنے

پر نادم ہو۔

''جوائس کے آنے کے بعد سے ہم آگاہ ہوئے ہیں،'' اس نے کہا،'' کہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا ایڈونچر، ہماری زندگی کا ایڈونچر سے تہی ہونا ہے۔ اوڈیسس ٹرائے میں لڑائی لڑا۔ خودکشتی کھینچتا ہوا گھر واپس لوٹا، اور ہر جزیرے میں پیچھے ایک داشتہ چھوڑتا آیا —— نہیں صاحب، یہ ہماری زندگی کا نقشہ ہرگز نہیں۔ ہومر کا ہفت خواں (Odyssey) اب انسان کے باطن میں واقع ہوتا ہے۔ آدمی نے اسے اپنے اندر اتار لیا ہے۔ جزیرے، سمندر، سائرن[۲] جو ہمیں پھانسنے کو تلی بیٹھی رہتی ہیں اور اتھاکا (Ithaca) جو ہمیں اپنی طرف آنے کی ترغیب دیتا ہے —— یہ سب گھٹ گھٹا کر بس اب ہمارے اندر اٹھنے والی آوازیں ہی رہ گئے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک! میں بھی بالکل یہی محسوس کرتی ہوں!'' بی بی نے ہانک لگائی۔ ''اسی لیے، مسٹر بناکا، میں آپ سے مل کر معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آدمی ان باتوں کو کس طرح لکھے۔ اکثر مجھے لگتا ہے جیسے میرا پورا جسم اظہار کی شدید خواہش سے پھٹا جا رہا ہے۔ یہ بات کرنا چاہتا ہے، کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ میرا دماغی توازن جاتا رہے گا۔ میں اپنی اندرونی گھٹن سے پھٹ پڑوں گی۔ مسٹر بناکا، آپ تو اِس کیفیت سے خوب واقف ہوں گے۔ میں اپنی رام کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ اپنے جذبات کی کہانی۔ سچ مچ یہ بالکل منفرد ہیں۔ یقین جانیے۔ لیکن میرے ہاتھ میں کاغذ پکڑا دیجیے اور مجال ہے جو یہ خیالات باقی رہیں۔ فوراً رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے خیال میں سارا مسئلہ تیکنیک کا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہے جو آپ جانتے ہیں اور جو میں نہیں جانتی۔ آپ کی کتابیں —— یہ کس قیامت کی ہوتی ہیں...''

۹

یہاں ان دونوں سقراطوں نے لکھنے لکھانے کے فن پر جو لیکچر اس عورت کو دیے، میں ان کو سنا کر آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی بجائے میں ایک بالکل مختلف چیز کے بارے میں بات کرنا

۲۔ siren: یونانی دیومالا کی وہ مخلوق جو آدھی عورت اور آدھی پرند ہوتی ہے، سمندر کے بیچ کسی چٹان پر رہتی ہے، اور ساحرانہ موسیقی سے غفلت میں آئے مسافروں کو پھانس لیتی ہے۔

چاہتا ہوں۔ حال ہی میں پیرس میں میں نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ میں شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے کو جا رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور خاصا باتونی آدمی نکلا۔ وہ رات کو نیند نہ آنے کی شکایت کرنے لگا۔ غالباً بے خوابی کے مرض میں بری طرح مبتلا تھا۔ یہ سب اس کے ساتھ جنگ کے دوران شروع ہوا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس کی کشتی ڈوب گئی تھی۔ وہ تین دن اور تین راتیں مسلسل تیرتا رہا، تا آنکہ اس کی جان بچالی گئی۔ اگلے چند ماہ وہ مستقل زندگی اور موت کے درمیان معلق رہا، اور گو آخر میں اس کی صحت بحال ہوگئی، تاہم سونے کی صلاحیت جاتی رہی۔

''میں آپ کے مقابلے میں ایک تہائی زیادہ زندگی گزارتا ہوں،'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اس زائد تہائی کا بھلا کیا کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''لکھتا لکھاتا ہوں، اور کیا،'' اُس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا، ''کیا لکھتے لکھاتے ہو؟''

''اپنی زندگی کی کہانی۔ اس آدمی کی کہانی جو مسلسل تین دن تک سمندر میں تیرتا رہا، موت کے سامنے ڈٹا رہا، سونے کی صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھا، لیکن زندہ رہنے کی قوت کا برابر تحفظ کیے گیا۔''

''تو کیا یہ سب تم اپنے بچوں وچوں کے واسطے لکھ رہے ہو؟ خاندانی کوائف قسم کی چیز؟''

''میرے بچوں کو اس کی ذرا پروا نہیں۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔ ''نہیں، میں ان واقعات کو جوڑ توڑ کر کتاب بنا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے اس کو پڑھ کر بہت سوں کا بہت بھلا ہوگا۔''

ایک ادیب کے سروکار کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس کے بارے میں مجھے ایک اتفاقیہ بصیرت ٹیکسی والے سے گفتگو کرتے ہوئے ہاتھ آئی۔ ہم کتابیں اس لیے لکھتے ہیں کہ ہماری اولاد کو ذرا پروا نہیں ہوتی۔ ہم اس لیے ایک انجانی کائنات کی طرف رخ کرتے ہیں کہ جب ہم اپنی بیوی سے بات کرتے ہیں تو وہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتی ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ڈرائیور کو کہیں لکھنے لکھانے کا جنون (graphomania) تو نہیں تھا۔ چلیے پہلے اس اصطلاح کی تعریف کرلیں۔ ایک عورت جو اپنے عاشق کو یومیہ چار خط لکھتی ہے، ہرگز اس مرض میں مبتلا نہیں: وہ تو صرف ایک محبت میں غرق عورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ میرا دوست جو اپنے عشقیہ خطوط کے فوٹو اسٹیٹ نکالتا ہے، صرف اس لیے کہ کسی دن ان کو شائع کر سکے، تو یقیناً میرا دوست اس

مرض کا شکار ہے۔ گرافومیپیا، خط، ڈائری یا خاندانی روزنامچہ (جو اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے لکھا جائے) لکھنے کی خواہش کا نام نہیں، بلکہ کتاب لکھنے کی خواہش کا نام ہے (تاکہ گمنام پڑھنے والوں کا ایک پورے کا پورا غول آدمی کے ہاتھ آ لگے)۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ٹیکسی ڈرائیور اور گیٹے (Goethe) دونوں میں لکھنے کا جنون مشترک نظر آئے گا۔ تاہم جو بات گیٹے کو ٹیکسی ڈرائیور سے ممتاز کرتی ہے وہ اس جنون سے پیدا ہونے والا نتیجہ ہے، بذاتِ خود جنون نہیں۔

گرافومیپیا (یعنی کتابیں لکھنے کا سودا) معاشرے میں اس وقت عام وبا کی شکل اختیار کر لیتا ہے جب معاشرہ اتنی ترقی کر چکا ہو کہ یہ تین بنیادی صورتیں بہم پہنچا سکے:

(۱) عام فلاح و بہبود کا وہ درجہ جہاں لوگ اپنی قوتوں کو فضولیات کے لیے وقف کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۲) معاشرتی تر زید (atomization) کا خاصا بڑھا ہوا درجہ اور نتیجے میں پیدا ہونے والا فرد کا احساس تنہائی۔

(۳) قوم کے ارتقائے باطنی میں کسی اہم سماجی تبدیلی کا بھیانک فقدان۔ (اس ضمن میں مجھے یہ بات کسی مرض کی علامت معلوم ہوتی ہے کہ فرانس، یعنی اس ملک میں جہاں ہوتا ہواتا کچھ نہیں، ادبا کی تعداد اسرائیل میں پائے جانے والے ادیبوں سے ۲۱ فیصد زیادہ ہے۔ بی بی نے بالکل ٹھیک دعویٰ کیا تھا کہ اُس نے باہر سے کسی چیز کا سرے سے کوئی تجربہ ہی نہیں کیا ہے۔ نفسِ مضمون (content) کا یہی نہ ہونا، یہی خالی پن ہے جو موٹر چلانے کے لیے توانائی بہم پہنچاتا ہے، اور اسے لکھنے پر اکساتا ہے۔)

لیکن معلول کو دیکھ کر علل کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو بہر حال ہو ہی جاتا ہے۔ اگر تنہائی کا عام احساس گرافومیپیا کو راہ دیتا ہے، تو خود جم غفیر کا اجتماعی گرافومیپیا عام احساس تنہائی کو تقویت پہنچاتا ہے اور اسے سنگین کر دیتا ہے۔ چھاپے خانے کی ایجاد نے اصلاً تو باہمی تفہیم کو فروغ دیا تھا۔ لیکن گرافومیپیا کے حوالے سے لکھنے لکھانے کا اثر بالکل الٹ ہوتا ہے: یعنی ہر کس و ناکس اپنے نوشتے کے انبار میں چاروں

طرف سے گھرا بیٹھا رہتا ہے، گویا یہ آئینوں سے مرصع دیوار ہو جو باہر سے آنے والی ہر آواز کا قلع قمع کر رہی ہو۔

۱۰

ایک روز جب کیفے میں کوئی گاہک موجود نہ تھا اور وہ بیٹھی اس سے گپ لگا رہی تھی، ہیوگو نے کہا، ''تمینا، مجھے خوب معلوم ہے کہ اس معاملے میں کامیابی کا ذرہ برابر امکان نہیں، چنانچہ میں بات گھما پھرا کر نہیں کہوں گا۔ یہ بتاؤ، کیا تم اتوار کو رات کے کھانے پر میرے ساتھ چل سکتی ہو؟''

پیکٹ اس کی ساس کے پاس صوبائی گھر میں ہے۔ تمینا چاہتی ہے کہ پیکٹ کسی طرح اس کے باپ کے پاس پہنچ جائے جو پراگ میں رہتا ہے، تا کہ بی بی جا کر وہاں سے لے آئے۔ یوں دیکھیے تو اب یہ کوئی ایسا بھاری کام نہیں۔ اِس سے زیادہ آسان بھلا اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ تاہم تمینا کو اپنا مدعا ان دونوں بلا کے ضدی بڈھے بڑھیا کو سمجھانے کے لیے کافی وقت اور پیسہ درکار ہوگا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک فون کرنا کافی مہنگا پڑتا ہے، اور تمینا کو جو تنخواہ ملتی ہے اس سے کرائے اور کھانے پینے کا بندوبست بھی بمشکل ہو پاتا ہے۔

''ٹھیک ہے،'' تمینا، یہ یاد کر کے کہ ہیوگو کے گھر ٹیلی فون لگا ہے، راضی ہو گئی۔ وہ اسے کار میں لینے آیا۔ پھر ایک مضافاتی ریستوراں میں لے گیا۔

وہ چاہتا تو تمینا کے ساتھ فاتح کی سی زبردستی کر سکتا تھا۔ وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی۔ اس ملک میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ لیکن اب کیا کیا جائے کہ ایک کم تنخواہ ویٹرس کے عقب میں وہ اُسے ایک پراسرار غیر ملکی عورت اور ایک بیوہ ہی نظر آتی تھی۔ اُس کے قدم لڑکھڑانے لگتے اور شک آ گھیرتا۔ تمینا کا لطف و کرم، زرہ بکتر کی طرح، اس کا سب سے بڑا محافظ تھا، ایک بلٹ پروف ویسٹ (bulletproof vest)۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ تمینا کی توجہ اپنی طرف کرائے۔ اس کا دل موہ لے۔ اس کے خیالات میں جاگزیں ہو جائے۔

بہت سر مارا کہ تمینا کی دلچسپی کی کوئی شے ہتھے چڑھ جائے اور اس طرح وہ اس کے دل تک راہ پائے۔ چنانچہ منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے وہ اسے ایک چڑیا گھر لے گیا جو ایک بے حد دلکش کنٹری شاتو

(country chateau) کی اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ گوتھک طرز کے کیم شحیم برجوں کے پس منظر میں وہ بندروں اور طوطوں کے درمیان سیر کرتے رہے۔ سوائے ایک دہقان صورت، اَن گھڑ مالی، کے، جو کشادہ روشوں پر منتشر پتوں کو جھاڑو دے کر صاف کر رہا تھا، وہ بالکل تنہا تھے۔ ایک بندر، ایک شیر، اور ایک بھیڑیے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایسے قطعے پر نکل آئے جس کے گرد احاطہ تھا اور اس میں شتر مرغ گھومتے پھر رہے تھے۔

کل چھ شتر مرغ تھے۔ جب انھوں نے تمینا اور ہیوگو کو دیکھا تو دوڑ لگا کر فوراً ان کے پاس چلے آئے اور تار کے احاطے کے اس طرف پاس پاس ایک گروہ کی شکل میں کھڑے ہو گئے۔ اپنی لمبی لمبی گردنیں دراز کیں اور دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی چوڑی اور چپٹی چونچوں کو پھٹ پھٹ کھولنے اور بند کرنے لگے، ایک بے قراری، ایک ناقابلِ یقین تیز رفتاری کے ساتھ، جیسے کسی مباحثے میں شریک ہوں اور تیز تیز باتیں کر کے حریف پر سبقت لے جانے کے درپے ہوں۔ لیکن ان کی چونچیں بالکل گونگی تھیں۔ ان سے ذرہ برابر آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

شتر مرغ وہ پیغامبر تھے جنھوں نے اپنے نہایت اہم پیغام کو دل پر نقش کر لیا تھا، لیکن جن کی صوتی نالیوں کو دشمن نے چاک کر کے انھیں قوتِ گویائی سے محروم کر دیا تھا؛ چنانچہ اب، منزلِ مقصود کو پہنچ کر وہ اتنا ہی کر سکتے تھے کہ محض اپنے منھ ہلاتے جائیں۔

تمینا، سحر زدہ سی، انھیں تیز سے تیز تر، نہایت تعمیل طلب انداز میں اپنا منھ ہلاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ اور ہیوگو وہاں سے ٹلے تو شتر مرغ بھی ان کے پیچھے پیچھے احاطے کی دیوار سے لگے لگے چلنے لگے۔ وہ اب بھی اپنی چونچیں چلائے جا رہے تھے، گویا تمینا کو کسی چیز سے خبردار کر رہے ہوں۔ لیکن کس چیز سے، وہ یہ نہ جان سکی۔

۱۱

''ایسا لگتا ہے گویا یہ کسی خوف زدہ کر دینے والی پریوں کی کہانی کا واقعہ ہو،'' تمینا نے چھری سے اپنے پاتے[۳] کو کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت اہم بات مجھے بتانا چاہتے ہوں لیکن

۳۔ pate: یہ وہی شے ہے جسے پاکستان کے بہائی ریستورانوں میں خلقت ''پے ٹس'' کے نام سے جانتی ہے۔

کیا بات؟ وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟''

ہیوگو نے سمجھایا کہ وہ بہت نوجوان قسم کے شتر مرغ تھے اور ان کا طور طریق بالکل ایسا ہی تھا جیسا تمام نوجوان شتر مرغوں کا ہوتا ہے۔ جب وہ پچھلی مرتبہ چڑیا گھر آیا تھا، تو اس بار بھی یہی چھ شتر مرغ دوڑ کر احاطے کی دیوار کے پاس آئے تھے اور چونچیں ہلانے لگے تھے۔

پھر بھی تمینا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح مضطرب رہی۔ ''تمھیں پتا ہے، میں پیچھے چیکوسلوواکیہ میں ایک پیکٹ چھوڑ آئی تھی۔ اس میں کچھ ضروری کاغذات تھے۔ اگر میں اسے منگوانے کے لیے لکھتی تو پولیس والے ضرور ضبط کر لیتے۔ بی بی آتی گرمیوں میں پراگ جانے والی ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ میرے لیے وہ پیکٹ وہاں سے لیتی آئے گی۔ اور اب مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ وہ شتر مرغ مجھے کسی بات سے خبردار کر رہے تھے، جیسے بتا رہے ہوں کہ اس پیکٹ کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہے۔''

ہیوگو کو معلوم تھا کہ تمینا بیوہ ہے، اور یہ بھی کہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اِس کا شوہر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے پوچھا، ''کاغذات سیاسی نوعیت کے تو نہیں تھے؟''

اب یہ بات تمینا کو بہت پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی کہ اگر وہ اس ملک والوں کو اپنی زندگی سے آگاہ کرنا چاہتی ہے تو اسے اس زندگی کو بہت سہل اور سادہ بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ ذاتی خطوط اور ڈائریاں کیوں ضبط کر لی جاتی ہیں اور وہ ان کے پیچھے کیوں اس قدر دیوانی ہوئی جا رہی تھی — یہ ایسی باتیں تھیں جن کی وضاحت غیر معمولی طور پر پیچیدہ تھی۔ چنانچہ اس نے صرف اتنا ہی کہا، ''بالکل، سیاسی نوعیت کے ہی۔''

کہنے کو تو یہ کہہ دیا، مگر اب یہ خوف دامن گیر ہوا کہ ہیوگو کہیں ان کاغذات کے بارے میں مزید کچھ اور نہ پوچھ بیٹھے۔ خیر ہوئی کہ اس نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ کب، کس نے، کس چیز کے بارے میں اس سے استفسار کیا تھا؟ بہت ہوا تو کبھی کبھار لوگ اس کے ملک کے بارے میں اپنے محسوسات کا اظہار کر دیتے۔ رہے خود اس کے ذاتی تجربات، تو کسی شخصِ واحد کو بھی ان سے دلچسپی نہیں تھی۔

''بی بی کو نہیں معلوم کہ یہ کاغذات سیاسی نوعیت کے ہیں؟'' ہیوگو نے پوچھا۔

''نہیں،'' تمینا نے جواب دیا۔

''یہ بہت اچھا ہوا،'' ہیوگو نے کہا، ''اس سے بھولوں ذکر نہ کرنا کہ اس کا سیاست سے دور کا بھی تعلق ہے۔ عین وقت پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے اور وہ انھیں وہیں چھوڑ چھاڑ آئے گی۔

تمینا، لوگوں کا کیا ہے، وہ کسی چیز سے بھی خوف زدہ ہو سکتے ہیں۔ خوب اطمینان کر لینا کہ بی بی انھیں بالکل غیر اہم، معمولی سے روکھے پھیکے کاغذات ہی سمجھتی رہے، جیسے مثلاً تمھارے عشقیہ خطوط! بالکل! یہ بات اس کی پہنچ کی ہے۔ ایسی بات ہے جو اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔''

تو گویا ہیوگو کے خیال میں عشقیہ خطوط بالکل بے حیثیت اور بے کیف چیز کا نام ہیں، تمینا نے سوچا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے کبھی کسی سے محبت کی تھی، کہ وہ محبت اس کے لیے بڑی پُر معنی تھی۔

''خدانخواستہ اگر بی بی وہاں نہ جا سکے،'' ہیوگو نے اپنی بات پر اضافہ کیا، ''تو اس معاملے میں تم مجھ پر پورا اعتماد کر سکتی ہو میں خود جا کر لے آؤں گا۔''

''شکریہ،'' تمینا نے گہرے اخلاص سے جواباً کہا۔

''جیل ہی کیوں نہ جانا پڑ جائے، وہ پیکٹ تمھارے لیے پھر بھی لے آؤں گا۔''

''بے وقوفی کی بات نہ کرو،'' تمینا نے احتجاج کیا۔ ''تمھارے جیل جانے کا کوئی امکان نہیں۔''

پھر اس نے ہیوگو کو سمجھایا کہ غیر ملکی سیاحوں کو چیکوسلوواکیہ میں کوئی خطرہ نہیں، خطرہ تو صرف چیک باشندوں کو ہے۔ اور اب تو وہ لوگ اُسے بھول بھال بھی چکے ہوں گے۔ اچانک وہ بڑی طول طویل اور نہایت جوشیلی تقریر کرنے لگ گئی تھی۔ اسے اپنے وطن کے چپے چپے کا کماحقہ علم تھا، اور میں آپ سے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی ہر بات بالکل سچ تھی۔

گھنٹے بھر بعد وہ ہیوگو کے فون کا ریسیور اپنے کان سے لگائے بیٹھی تھی لیکن اس بار بھی اسے اپنی ساس کو رام کرنے میں اتنی ہی کامیابی ہوئی جتنی پہلی بار، یعنی صفر ــــ ''تم نے مجھے کوئی چابی وابی نہیں دی تھی! تم ہمیشہ ہر چیز مجھ سے چھپا کر رکھا کرتی تھیں! اتنی تکلیف دہ یادوں کی بازخوانی کا فائدہ؟''

۱۲

اگر تمینا کو اپنی یادیں اتنی ہی عزیز ہیں تو خود کیوں چیکوسلوواکیہ نہیں چلی جاتی؟ ان چیک شہریوں کو جنھوں نے ۱۹۶۸ء کے بعد غیر قانونی طور پر ملک چھوڑا تھا، عام معافی دی جا چکی ہے، اور ان سے واپس ملک لوٹنے کی درخواست بھی کی جا چکی ہے۔ تمینا کو اب کس بات کا خوف ہے؟ ظاہر ہے وہ اتنی

بے حیثیت ہے کہ اسے کسی بات کا خطرہ نہیں ہوسکتا!

صحیح، بالکل صحیح۔ وہ بلا خوف وخطر واپس جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہیں جاسکتی۔

وہاں، گھر میں، ہر فرد و بشر نے اس کے شوہر کے ساتھ دغا[۴] کی تھی۔ اب اگر وہ واپس جاتی ہے تو اسے بھی اپنے شوہر کے ساتھ دغا کرنے کا خطرہ لاحق رہے گا۔

جب انھوں نے رفتہ رفتہ اس کا عہدہ گھٹا کر بالآخرا سے ملازمت ہی سے برطرف کر دیا تو کوئی ماں کا لال اس کی حمایت کے لیے نہیں کھڑا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے عزیز ترین دوست تک نہیں۔ اب یہ بھی نہیں کہ تمینا حقیقت سے بالکل ہی نابلد تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ سارے احباب اس کے حامی تھے، اور محض خوف کے مارے اس کے اظہار سے کترا رہے تھے۔ اور بعینہٖ یہ بات کہ وہ اس کے حامی تھے، انھیں اپنے یوں خوف زدہ ہونے پر خجل کر رہی تھی۔ سڑک پر کہیں نظر آتے تو یوں انجان بن جاتے جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ محل شناسی کے سبب دونوں میاں بیوی خود ہی ان سے کنی کاٹنے لگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے دوست اپنے سے اور زیادہ نادم ہوں۔ دیکھتے دیکھتے دونوں کی یہ حالت ہوگئی گویا کوڑھیوں کی جوڑی ہوں۔ جب وہ چیکوسلوواکیہ سے نکل آئے تو پیچھے اس کے شوہر کے سابقہ ہم منصبوں نے ایک ایسے عوامی اعلان نامے پر جس میں اس کے شوہر پر کیچڑ اچھالا گیا تھا، دستخط کر دیے۔ ظاہر ہے یہ قدم انھوں نے ملازمت سے برطرف کر دیے جانے کے خوف سے اٹھایا تھا۔ کچھ بھی سہی، اٹھایا تو تھا، اور یوں انھوں نے اپنے اور ان دو بے یار و مددگار مہاجرین کے درمیان ایک اچھا خاصا گڑھا کھڑا کر دیا تھا۔ یہ وہ گڑھا تھا جسے تمینا کبھی عبور نہ کرنے کی آرزو مند تھی۔

فرار ہونے کے بعد پہلی صبح جب وہ آلپس (Alps) پہاڑوں میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیدار ہوئے اور خیال آیا کہ اب وہ بالکل تنہا ہیں، اس پوری کائنات سے منقطع جو کل تک ان کی تمام تر زندگی رہی تھی، تو تمینا نے خود کو بے حد آزاد محسوس کیا، اور بے حد مطمئن بھی۔ وہ پہاڑوں میں تھے، اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ تنہا بھی۔ ایک ناقابلِ یقین، بے پناہ خاموشی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ تمینا کو یہ ایک قطعی غیر متوقع تحفہ معلوم ہوئی۔ اچانک اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اگر

۴۔ اصل لفظ جو انگریزی میں استعمال ہوا ہے وہ betray ہے۔ کوئی مناسب اور مترادف لفظ نہیں مل رہا، اور "دغا" سے بھی کام نہیں چل رہا۔ سو دونوں حاضر ہیں۔

اس کے شوہر کو جوروستم سے بچنے کے لیے چیکوسلوواکیہ کو الوداع کہنا پڑا تھا تو خود تمینا کو اس بے کراں سکوت کے حصول کے لیے ــــ وہ سکوت جو محض اس کے اور اس کے شوہر کے لیے تھا، محبت کے لیے۔
جب اس کے شوہر کا انتقال ہوا تو تمینا پر اچانک گھر کی یاد کا دورہ پڑا۔ اسے ایک ایسے ملک کے لیے بے پناہ ناسٹلجیا محسوس ہوا جہاں ان کی ازدواجی زندگی کی اولین دہائی نے جہاں تہاں اپنے بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہوئے تھے۔ جذباتیت کی ایک نا قابلِ برداشت لہر اٹھی جس کے زیر اثر اس نے اپنے شوہر کے کوئی دس رفقا کو اس کی موت کا اطلاع نامہ بھیج دیا۔ پلٹ کر ایک نے بھی رسید نہ بھیجی۔
ایک ماہ بعد اس نے کوڑی کوڑی جوڑی ہوئی ساری رقم نکالی اور ساحل سمندر کی سیر کو چل پڑی۔
اس نے اپنا پیرا کی کا لباس پہنا، اعصابی ہیجان کو سکون پہنچانے والی گولیوں کی پوری شیشی نگلی، اور تیرتی ہوئی دور، بہت دور، سمندری پانیوں میں چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ گولیوں کی طاقت سے نڈھال ہو جائے گی اور بکمال خاموشی غرقاب، لیکن پانی کی غیر معمولی ٹھنڈک اور اس کے پیرا کی کے استادانہ، طاقتور ہاتھوں نے اسے اونگھ جانے سے باز رکھا۔ (وہ درجہ اول کی پیراک رہی تھی ــــ ہمیشہ ہی۔) گولیوں کی تاثیر غیر متوقع طور پر کمزور ثابت ہوئی۔
وہ مڑی اور تیرتی ہوئی واپس ساحل پر لوٹ آئی۔ اپنے کمرے میں گئی اور پورے بیس گھنٹے تک دنیا و مافیہا سے بے خبر مسلسل سوتی رہی۔ جب وہ بیدار ہوئی تو خود کو بے حد پرسکون اور خاموش محسوس کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خاموشی میں اور خاموشی ہی کے لیے زندہ رہے گی۔

۱۳

بی بی کے ٹیلی وژن کی نیلگوں، چاندی ایسی روشنی تمینا، یویو، بی بی، اور اس کے شوہر ڈے ڈے (Dede) پر (جو ایک ٹریولنگ سیلز مین تھا اور ابھی کل ہی چار روز باہر رہنے کے بعد لوٹا تھا) پڑ رہی تھی۔ کمرے میں پیشاب کی خفیف سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیلی وژن کے پردے پر ایک غیر مرئی ماسٹر آف سیرے منیز (Master of Ceremonies) ایک بڑے گول مٹول گنجے سر والے سے ایک بڑا ہی اشتعال انگیز سوال کر رہا تھا: "آپ کی سرگزشت (memoirs) میں بعض بڑے حیرت انگیز جنسی اعترافات ملتے ہیں۔"

یہ ایک باقاعدہ ہفتہ وار پروگرام تھا جس میں ایک مشہور و معروف ماسٹر آف سیرے مینیز ان ادیبوں سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا تھا جن کی کتابیں ہفتہ گذشتہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی ہوں۔

بڑے سے گنجے سر والا خوش دلی سے مسکرایا۔''حیرت انگیز؟ اجی جانے دیجیے، ایسی بات کہاں ہے۔اسے باقاعدہ علمِ شماریات کہیے، بس۔خود دیکھ لیجیے: پہلی بار جب میں نے ہم بستری کی تو اس وقت میری عمر پندرہ سال تھی... ''— گول مٹول سر والے بڑے میاں نے بڑے فخر سے چینل کے ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف باری باری دیکھا— ''جی ہاں، پندرہ سال۔اب میں پینسٹھ برس کا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم کوئی پچاس سالہ فعال جنسی زندگی کی بات کر رہے ہیں۔فرض کیجیے کہ میں نے ہفتے میں اوسطاً دو بار مجامعت کی— بہت واجبی سا تخمینہ ہے— تو سالانہ کوئی سو بار۔یعنی کلیتاً کوئی پانچ ہزار بار۔آگے چلیے۔اگر جماع کی مستی (orgasm) پانچ سیکنڈ قائم رہتی ہے، تو پچیس ہزار سیکنڈوں کی جماعی مستی میرے کھاتے میں آتی ہے۔ان کو جمع کیجیے تو چھ گھنٹے اور چھپن منٹ بنتے ہیں۔ایسا کوئی بڑا ریکارڈ نہیں، کیوں کیا خیال ہے؟''

کمرے میں موجود بھی نے بے حد سنجیدگی سے اپنا اپنا سر ہلا دیا، سوائے تمینا کے، جو تصور میں اس گنجے کھوسٹ کو مسلسل آرگازم کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔پیچ کھاتا ہوا، شدید تشنج کے عالم میں، کبھی اپنا دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔پندرہ منٹ میں ہی نقلی دانتوں کا چوکھٹا پٹ سے نیچے گر پڑتا ہے، اور پانچ منٹ میں ہی موصوف خود گر کر داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہیں۔تمینا کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

''یہ ہنسنے کی ایسی کون سی بات ہے؟''بی بی جھلا کر پوچھتی ہے۔''یہ اعداد و شمار خاصے مرعوب کن ہیں۔آرگازم کے چھ گھنٹے اور چھپن منٹ!''

''اب مجھ ہی کو لے لو۔سالوں مجھے یہی پتا نہ چلا کہ آرگازم نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے،''یو یو نے کہا،''لیکن پچھلے سال سے یہ مجھے بھی باقاعدہ ہونے لگے ہیں۔''

اب ہر کوئی یو یو کے آرگازم کے بارے میں بات کرنے لگا۔جلد ہی ایک اور چہرہ، برہمی اور خفگی سے لبالب بھرا، پردے پر آدھمکا۔

''یہ حضرت کس چیز پر اس قدر خفا نظر آ رہے ہیں؟''ڈے ڈے سوچ میں پڑ گیا۔

''اور یہ بات بے حد اہم ہے،''پردے پر ادیب صاحب فرما رہے تھے،''بے حد اہم۔اور یہ

سب بلاکم وکاست میری کتاب میں موجود ہے۔''

''کیا بے حد اہم ہے؟'' بی بی نے پوچھا۔

''کہ انھوں نے اپنا پورا بچپن رورو(Rourou) نامی گاؤں میں گزارا۔''

وہ آدمی جس نے اپنا سارا بچپن رورو کے گاؤں میں گزارا تھا، اس کی ناک ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لمبی تھی اور اتنی وزنی کہ اس کے باعث اس کا پورا جسم لنگر کی طرح بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کا سر بتدریج دھنسا جا رہا تھا اور دو ایک بار ایسا لگا کہ وہ اسکرین سے لڑکھڑا کر ابھی دھڑام سے نیچے کمرے کے فرش پر آ رہے گا۔ اس کی حالت سخت تشنجی تھی۔ ''یہ سب بلاکم وکاست میری کتاب میں موجود ہے۔ میری پوری تخلیقی ذات اس سیدھے سادے سے گاؤں میں لپٹی پڑی ہے۔ جب تک آپ یہ بات نہیں سمجھ لیتے، میرے لکھے سے غلط مطلب ہی نکالیں گے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں، بہر حال، میں نے اپنی چند اولین نظمیں کہی تھیں۔ جی ہاں، بالکل، میں اسے شدید اہمیت کا حامل سمجھتا ہوں۔''

''بعض مردوں سے مجھے آرگازم بالکل نہیں ہوتا،'' بی بی نے انکشاف کیا۔

''اور یہ مت بھولیے،'' ادیب صاحب کچھ اور زیادہ ہیجان میں آ کر بولے، ''کہ یہیں میں پہلی بار سائیکل پر سوار ہوا تھا۔ جی جی، بالکل۔ اور یہ سارے کا سارا میری کتاب میں موجود ہے۔ بس اسے ایک علامت سمجھیے۔ میرے خیال میں سائیکل اس قدم کی علامت ہے جو آدمی قبیلے کی دنیا سے اٹھا کر تہذیب کی دنیا میں رکھتا ہے۔ تہذیب سے پہلی پہلی تفریح بازی (فلرٹ)۔ ایک کنواری جو پہلے بوسے سے قبل فلرٹ کر رہی ہو۔ ہنوز کنواری، تاہم شریکِ گناہ۔''

''یہ اس نے بالکل ٹھیک کہا،'' یویو نے پھٹ سے رائے دے ڈالی۔ ''تناکا(Tanaka)، ایک لڑکی جس کے ساتھ میں کام کرتی ہوں، تو اس کو اپنا پہلا آرگازم اس وقت ہوا جب وہ بائیسکل کی سواری کر رہی تھی؛ وہ اس وقت تک بالکل کنواری تھی۔''

سو اب وہ تناکا کے آرگازم کی بات کرنے لگے، اور تمینا نے بی بی سے پوچھا کہ کیا وہ اس کا ٹیلی فون استعمال کر سکتی ہے۔

۱۴

برابر والے کمرے میں پیشاب کی بو مقابلتاً زیادہ تھی۔ بی بی کی بچی وہاں سو رہی تھی۔

''مجھے پتا ہے کہ آپ کی اس سے بات چیت بند ہے،'' تمینا نے سرگوشی میں کہا۔ ''لیکن میرے پاس اسے حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ بھی تو نہیں۔ آپ کو وہاں جا کر اُس سے ملنا ہی پڑے گا۔ چابی نہ ملے تو اس سے کہیں کہ تالا توڑ کر دراز کھول لے۔ اس کے پاس میری کچھ چیزیں ہیں۔ خطوط ــــ مجھے انھیں حاصل کرنے کا پورا حق ہے۔''

''تمینا، خدا کے واسطے مجھے اس عورت سے بات کرنے پر مجبور نہ کرو۔''

''ہمت کر کے یہ کام کر ہی دیجیے، میری خاطر۔ ڈیڈی، کر دیں گے نا؟ وہ آپ سے بہت ڈرتی ہے۔ آپ جائیں گے تو اسے منع کرتے نہ بنے گی۔''

''ایک بات سنو۔ میرے پاس ایک بہت اعلیٰ فرکوٹ ہے۔ جب تمھارے دوست مجھ سے پراگ آ کر ملیں گے تو میں یہ تمھارے لیے دے دوں گا۔ واپسی پر تمھیں پہنچا دیں گے۔ یہ پرانے خطوط کے بنڈل سے بہرحال بہتر چیز ہے۔''

''لیکن مجھے فرکوٹ نہیں چاہیے۔ مجھے تو صرف وہی پیکٹ چاہیے!''

''ذرا اونچا بولو، تمھاری آواز سنائی نہیں دے رہی،'' تمینا کے باپ نے کہا۔ لیکن تمینا دانستہ سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بی بی اسے چیک زبان میں بات کرتا ہوا سن لے۔ ورنہ تاڑ جائے گی کہ لانگ ڈسٹینس کال ہو رہی ہے، اور یوں بیٹھے بٹھائے اس کی قیمت اُسے بی بی کو دینی پڑ جائے گی۔

''مجھے صرف وہ پیکٹ ہی چاہیے۔ آپ کا فرکوٹ نہیں۔''

''تم آج تک نہیں سیکھ سکیں کہ تمھاری زندگی میں اصلاً کن چیزوں کو سبقت حاصل ہونی چاہیے۔''

''دیکھیے ڈیڈی، یہ کال مجھے بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ خدارا اس سے جا کر ملیے۔''

مکالمہ جاری رکھنا محال تھا۔ تمینا کا باپ بار بار مختلف باتوں کو اونچی آواز میں دہرانے کے لیے کہتا رہا اور نہایت ہٹ دھرمی سے بڑی بی سے جا کر ملنے سے انکار کر دیا۔

"تم اپنے بھائی کو فون کیوں نہیں کرتیں؟" اس نے آخر کار تجویز پیش کی۔ "اس سے کہو کہ تمھاری ساس سے جا کر ملے، وہاں سے پیکٹ لے آئے اور میرے حوالے کر دے۔"

"مگر وہ میری ساس کو جانتا تک نہیں۔"

"ساری بات تو یہی ہے،" تمینا کا باپ ہنس پڑا۔ "اگر جانتا ہوتا تو بھول کر بھی اس سے ملنے کا خیال نہ آتا۔"

تمینا نے جلدی جلدی غور کیا۔ اب یہ کوئی ایسی بری تجویز بھی نہیں تھی۔ اس کا بھائی بڑا مستعد اور جیالا آدمی تھا۔ اسے لوگوں سے اپنی بات منوانے کا گر بھی خوب آتا تھا۔ لیکن تمینا خود اسے فون نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب سے وہ ملک سے نکلی تھی، آج تک دونوں نے ایک دوسرے کو ایک بھی خط نہیں لکھا تھا۔ وہ بڑی اچھی تنخواہ پر ملازم تھا، اور اس پر ابھی تک محض اس لیے قائم تھا کہ اس نے اپنی مہاجر بہن کے سارے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔

"میں اسے فون نہیں کر سکتی، ڈیڈی۔ آپ خود بات کر کے اسے سمجھا دیں۔ سمجھا دیں گے نا؟ پلیز ڈیڈی!"

۱۵

ڈیڈی چھوٹا سا مدقوق آدمی تھا۔ جب وہ تمینا کو لیے سڑک کے کنارے کنارے چلتا تو اتنا فخرمند نظر آتا گویا دنیا کو اُس رزمیہ رات کی یادگار پیش کر رہا ہو جس میں اس نے تمینا کا بیج بویا تھا۔ اسے اپنا داماد کبھی ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتا۔ جب اس نے تمینا کو فرکوٹ بھیجنے کی پیش کش کی (جو اسے اپنی کسی رشتے دار سے ترکے میں ملا ہوگا)، تو اس کا محرک داماد خسر کی کہنہ رقابت تھی، نہ کہ اپنی بیٹی کی تندرستی کے بارے میں تشویش۔ وہ چاہتا تھا کہ تمینا اپنے شوہر (خطوط کا بنڈل) پر اپنے باپ (فرکوٹ) کو ترجیح دے۔

اس خیال ہی سے تمینا پر باقاعدہ ہیبت طاری ہو گئی کہ اس کے پیکٹ کی قسمت اس کی ساس اور اس کے باپ کے معاندانہ ہاتھوں میں تھی۔ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی، اتنا ہی اسے محسوس ہوتا کہ اس کی نجی نوٹ بکس اغیار پڑھ رہے ہیں، اور اغیار کی آنکھیں اس برسات کی مانند ہیں جو پتھر کی دیوار پر

کندہ تحریر کو مٹائے دے رہی ہو۔ یا پھر وہ روشنی ہو جو ڈویلپر (developer) میں جانے سے پہلے تصویر سازی کے کاغذ پر پڑے اور اس میں پنہاں عکس کو برباد کردے۔

اسے خیال آیا کہ جو بات اس کی نوشتہ یادداشتوں کو قدر و قیمت اور معنی بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ یادداشتیں صرف اسی کے لیے تھیں۔ جس لمحے ان کا یہ وصف جاتا رہے گا، تعلق کا وہ گہرا رشتہ بھی بکھر جائے گا جو ان یادوں سے اس کو وابستہ کرتا ہے۔ ایسا ہوا تو وہ ان نوشتوں کو اپنی آنکھوں کی بجائے ناظرین کے اس مخصوص نقطۂ نظر سے پڑھنے پر مجبور ہو جائے گی جو لاتعلقی سے کسی غیر شخصی دستاویز کی چھان پھٹک کرر ہے ہوں۔ ایسا ہوا تو وہ عورت جس نے انھیں لکھا ہے، اپنی شناخت کھو بیٹھے گی۔ اور وہ نمایاں مماثلت جو اس کے باوجود اس کے اور ان یادداشتوں کو رقم کرنے والی کے درمیان رہ جائے گی، اُس کی حیثیت محض ایک مضحکہ خیز، بھونڈی نقل سے زیادہ نہ ہوگی۔ نہیں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ ان یادداشتوں کو کسی غیر کی نظر سے گزر چکنے کے بعد خود بھی کبھی پڑھنے کے قابل رہ سکے۔

یہی بات تھی جو وہ اتنی بے صبری ہو رہی تھی اور اس آرزو میں فنا ہوئی جارہی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ان نوٹ بکس، ان خطوط کو اپنی تحویل میں لے آئے قبل اس کے کہ ان میں پنہاں ماضی کی شبیہ زائل ہو جائے۔

۱۶

ایک روز بی بی کیفے میں آکر بار والے حصے میں بیٹھ گئی۔ ''ہیلو، تمینا،'' اس نے کہا، ''ذرا ایک وہسکی تو دو۔''

عام طور پر بی بی کافی کا آرڈر دیا کرتی تھی۔ یا بہت ہوا تو کبھی کبھار پورٹ[۵] کا۔ وہسکی کا آرڈر دے کر گویا وہ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ کوئی بات ضرور ہے۔

''تمھارے لکھنے لکھانے کا کیا حال ہے؟ کہاں تک پہنچیں؟'' تمینا نے مشروب گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''اگر میرا موڈ ٹھیک ہوتا تو کام بھی ٹھیک ٹھاک چلتا رہتا،'' بی بی نے جواب دیا، مشروب ایک ہی

۵۔ port: گہرے سرخ رنگ کی ایک تیز میٹھی شراب۔

سانس میں حلق میں انڈیل لیا، اور دوسرے کا آرڈر دے ڈالا۔

کچھ اور گاہک کیفے میں داخل ہوئے۔ تمینا نے ان سے پوچھا کہ کیا کھائیں پئیں گے۔ پھر وہ بار میں واپس آئی، اپنی دوست کو وہسکی کا دوسرا گلاس دیا، اور نو واردوں کی خبر گیری میں لگ گئی۔ جب دوبارہ واپس آئی تو بی بی نے بتایا: ''میں ڈے ڈے سے عاجز آ گئی ہوں۔ جب بھی دورے سے لوٹتا ہے، مسلسل دو دن بستر میں اینڈا پڑا رہتا ہے، اور شب خوابی کا لباس تک نہیں تبدیل کرتا۔ پاگل کر دینے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، ہے نا؟ اس کے باوجود، ستم دیکھو، ساتھ سونے کے لیے بالکل چاق و چوبند۔ یہ بات سمجھ کر نہیں دیتا کہ میرے لیے ہم بستری کی کچھ اہمیت نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اب مجھے اُس سے علیحدہ ہونا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمہ وقت اپنی احمقانہ تعطیلات کے خیال میں مگن رہتا ہے۔ بستر میں پڑے پڑے سامنے اٹلس (atlas) پھیلائے مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ پہلے پراگ جانا چاہتا تھا۔ اب یہ خیال خواب ہو گیا ہے۔ آئر لینڈ پر کوئی کتاب ہتھے چڑھ گئی ہے۔ سو وہاں جانے کے شوق میں مرا جا رہا ہے۔''

''تو کیا اب چھٹیاں گزارنے تم لوگ آئر لینڈ جا رہے ہو؟'' تمینا نے پوچھا۔ اسے اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہم آئر لینڈ جا رہے ہیں؟ ہم کہیں نہیں جا رہے۔ میں یہاں سے ہلنے والی نہیں۔ بس یہیں رہوں گی اور کتاب لکھوں گی۔ مجھے اُس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے کب میری پروا ہے۔ یہاں میں لکھنے لکھانے میں مشغول ہوں، اور تمھارا کیا خیال ہے کہ یہ مجھ سے اتنا بھی پوچھتا ہے کہ لکھ کس چیز کے بارے میں رہی ہو۔ جھک مار کر اب معلوم ہو رہا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے واسطے اب کچھ نہیں رہ گیا۔''

تمینا پوچھنا چاہتی تھی، ''تو اب پراگ جانے کا ارادہ نہیں رہا؟'' لیکن حلق میں پھنسی چیز کا حجم یکبارگی بڑھ گیا اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ٹھیک اسی لمحے یو یو کیفے میں داخل ہوئی، بار اسٹول پر اچک کر جا سوار ہوئی، اور سوال داغا: ''کیا تم سب کے سامنے کر سکتی ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''مثلاً یہاں کیفے میں، ٹھیک فرش پر، سب کے سامنے، یا پھر سینما میں فلم کے دوران؟''

''چپ!'' بی بی نے سر نیچا کر کے اسٹول کے پائے کے پاس کھڑی شور وغل مچاتی ہوئی اپنی بچی سے کہا، پھر سر اٹھایا اور کہا،'' ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ کوئی غیر فطری بات تو ہے نہیں — یا ہو تو بتاؤ؟ جو چیز فطری ہے اسے کرنے میں مجھے کیا شرم!''

تمینا پھر تذبذب میں پڑ گئی کہ بی بی سے اس کے پراگ کے دورے کے بارے میں پھر سے پوچھے یا نہ پوچھے۔ لیکن اب یہ سوال ہی سرے سے غیر ضروری ہو گیا تھا۔ اسے خوب پتا تھا، بالکل واضح تھا کہ بی بی پراگ جانے والی نہیں تھی۔

اتنے میں باورچی خانے سے کیفے کے مالک کی بیوی نکل کر اس طرف چلی آئی اور بی بی کو دیکھ کر مسکرائی۔'' کیا حال ہے؟'' اس نے بی بی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں اگر ضرورت ہے تو بس انقلاب کی،'' بی بی نے اعلان کیا۔'' کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ یہاں ضرور ہونا چاہیے۔''

اس شب تمینا نے شتر مرغوں کو خواب میں دیکھا۔ وہ اب بھی احاطے کے اندر دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے اور مسلسل بک بک کیے جا رہے تھے۔ وہ خوف زدہ ہو گئی اور ہل جل تک نہ سکی۔ محض سحر زدہ سی انھیں اپنی چونچیں چلاتے تکتی رہی۔ پھر اس نے اپنے لب مضبوطی سے بھینچ لیے۔ اس کے منھ میں ایک طلائی انگشتری تھی اور وہ اس کی حفاظت کے بارے میں سخت خائف تھی۔

۱۷

میں اسے منھ میں طلائی انگشتری چھپائے کیوں تصور کرتا ہوں؟

اس معاملے میں آپ مجھے قطعی معذور سمجھیے۔ کیا کروں، وہ مجھے اسی طرح نظر آتی ہے۔ ایک تحریر جسے پڑھے ہوئے زمانہ ہو گیا، اچانک ذہن میں در آتی ہے:'' ایک ملائم، شفاف، دھاتی آواز، جیسے کوئی طلائی انگشتری نقرئی تسلے میں گر رہی ہو۔''[6]

طامس مان (Thomas Mann) نے اپنی جوانی میں موت کے بارے میں ایک سادہ لوح

۶۔ A soft clear metallic tone, like a golden ring falling into a silver basin.

اور بڑی ساحرانہ کہانی لکھی تھی۔ اس میں موت کو بے حد حسین دکھایا گیا ہے، کیونکہ ایسے تمام لوگوں کو جو کم عمری میں اس کا خواب دیکھتے ہیں، موت ہمیشہ ہی بڑی دل آویز نظر آتی ہے، کیونکہ اس زمانے میں، دور افتادہ جگہوں میں گونجنے والی نیلگوں آوازوں کی طرح، یہ ہنوز بڑی غیر حقیقی اور طلسماتی ہوتی ہے۔

ایک نوجوان جسے مرضِ موت لاحق ہے، ایک نامعلوم اسٹیشن پر ریل گاڑی سے اترتا ہے۔ شہر میں داخل ہوتا ہے — شہر کا نام اسے معلوم نہیں — اور ایک بوڑھی عورت کے گھر میں، جس کی پیشانی خارش کے دھبوں سے بھری ہے، چند کمرے کرائے پر لیتا ہے۔ جی نہیں، مجھے اس واقعے کو بیان کرنے کی کوئی خواہش نہیں جوان کرائے پر لیے گئے کمروں میں پیش آیا۔ میں تو صرف ایک بے حد معمولی سے واقعے کی بازخوانی کرنا چاہتا ہوں: سامنے کے کمرے کے گرد چلتے ہوئے اس بیمار نوجوان کو معاً یہ احساس ہوا کہ ''اپنے قدموں کی آواز کے درمیان اُس نے ایک اور آواز بھی سنی جو اس کے دور و یہ کمروں سے آ رہی تھی — ایک ملائم، شفاف دھاتی آواز — لیکن ممکن ہے یہ محض فریب ہی ہو۔ جیسے کوئی طلائی انگشتری نقرئی تسلے میں گر رہی ہو، اس نے سوچا...''

اس ادنیٰ سے صوتی واقعے کو کہانی میں کہیں بھی سلیقے سے ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ہی واضح۔ محض عمل کے اعتبار ہی سے دیکھیں تو اسے بغیر کسی بڑے خسارے کے حذف کیا جا سکتا تھا۔ وہ آواز تو بس خود بخود وجود میں آ گئی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ طامس مان نے صرف اس لیے یہ ''ملائم، شفاف، دھاتی آواز'' سنوائی ہے کہ مکمل خاموشی کا تاثر قائم ہو سکے، وہ خاموشی جس کے حسن کو سماعی بنانے کی اسے ضرورت تھی، اور وہ اِس لیے کہ جس موت کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ وہ موتِ حسن (beauty-death) تھی، اور حسن کو لائقِ ادراک بننے کے لیے خاموشی کی ایک مخصوص کم سے کم مقدار کی ضرورت ہوتی ہے (جس کا مناسب ترین پیمانہ، اتفاق سے، طلائی انگشتری کی نقرئی تسلے میں گرنے کی آواز ہے)۔

(جی ہاں، میں جانتا ہوں۔ آپ کو ذرا پتا نہیں کہ میرا مدعا کیا ہے۔ حسن کو سدھارے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ خوب صورتی کھسک کر سطح کے شور و شغب کے نیچے چلی گئی ہے — شور: لفظوں کا شور، کاروں کا شور، موسیقی کا شور، علامتوں کا شور جس میں ہم مسلسل زندگی کرتے ہیں۔ یہ اتنی ہی غرقِ آب ہو چکی ہے جتنا جزیرۂ اطلانتس (Atlantis)، اور اس کی باقیات میں صرف لفظ ہی بچ رہا ہے، جس

کے معنی سال بہ سال اپنی صراحت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔)

پہلی بار جب تمینا نے اس خاموشی کو سنا (جو اتنی ہی بیش قیمت تھی جتنا غرق شدہ اطلانٹس پر پائے جانے والے مرمریں مجسموں میں سے کسی مجسمے کا ٹکڑا) تو یہ اس وقت تھا جب وہ چیکوسلوواکیہ سے فرار ہونے کے بعد، جنگل کے بیچوں بیچ، اس الپائن ہوٹل میں سو کر اٹھی تھی: اور دوسری بار اس وقت جب وہ سمندر میں تیرتی چلی جارہی تھی، اس حال میں کہ پیٹ اعصابی تشنج کو کم کرنے والی گولیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ گولیاں جو اس کے لیے موت کی بجائے غیر متوقع سکون لائیں۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ وہ اس خاموشی کو کبھی اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دے گی، کہ اسے اپنے اندر اتار کر وہیں تھامے رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے اپنے خواب کی ایک دیوار کے مقابل کھڑی ہوئی نظر آتی ہے، اس حال میں کہ ایک طلائی انگشتری اس کے مضبوطی سے بند منھ میں ہے۔

وہ چھ طویل گردنوں کے سامنے کھڑی ہے، جن کے سر چھوٹے چھوٹے ہیں اور جن کی چپٹی چپٹی چونچیں بنا خفیف سی آواز پیدا کیے، دیوانہ وار کھل بند ہو رہی ہیں۔ وہ ان کی بات سمجھنے سے معذور ہے۔ وہ اسے ڈرا دھمکا رہی ہیں یا خبردار کر رہی ہیں، استدعا کر رہی ہیں یا التجا — اسے کچھ پتا نہیں، اور چونکہ وہ ان کا مدعا سمجھنے سے قاصر ہے، اس لیے بے حد فکرمند اور مضطرب ہے۔ اسے ڈر ہے کہ اس طلائی انگوٹھی (خاموشی کے سُر ٹھیک کرنے کا کانٹا) کے ساتھ کوئی دردناک واقعہ پیش آنے والا ہے، اور وہ اسے محفوظ رکھنے کے لیے مضبوطی سے بند منھ میں دھرے ہوئے ہے۔

یہ تمینا کبھی نہ جان سکے گی کہ وہ اس سے کیا کہنے آئے تھے۔ لیکن مجھے پتا ہے۔ وہ اسے متنبہ کرنے، ڈرانے دھمکانے، یا اس کی تہدید کرنے ہرگز نہیں آئے تھے۔ انھیں تمینا سے بھلا کیا لینا دینا۔ وہ، ان میں سے ایکو ایک صرف اسے اپنے بارے میں ہی بتانے آیا تھا۔ یہ بتانے کہ وہ کس طرح دانہ چگتے تھے، کس طرح سوتے تھے، کس طرح دوڑ کر چار دیواری تک آتے تھے، اور دیوار پار انھیں کیا کچھ نظر آتا تھا؛ کہ کس طرح انھوں نے اپنا بے حد اہم بچپن، اتنے ہی اہم رورو کے گاؤں میں، گزارا تھا، اور کس طرح ان کا نہایت اہم آرگازم پورے چھ گھنٹے تک جاری رہا تھا؛ کہ وہ عورت جس نے اپنا سر ایک بُنی ہوئی شال سے ڈھکا ہوا تھا، انھیں کس طرح نظر آرہی تھی؛ کہ وہ کس طرح تیرے، بیمار پڑے، پھر روبصحت ہوئے؛ کہ کس طرح وہ کبھی جوان رہے تھے، بائیسکلوں کی سواری کی تھی، اور اس دن گھاس

کے ایک پورے تھیلے کی جگالی کی تھی۔ لو، وہ دیکھو، وہاں کھڑے ہوئے ہیں، تمینا کے عین مقابل، اسے اپنی کہانی سنا رہے ہیں؛ سب کے سب ایک ساتھ، بڑے تاکیدی، محاربانہ، جارحانہ انداز میں۔ کیونکہ جو بات وہ اس سے کہنا چاہتے ہیں، اس سے زیادہ اہم کوئی اور چیز نہیں۔

۱۸

چند دن بعد بنا کا نشے میں دھت کیفے میں داخل ہوا اور ایک بار اسٹول پر براجمان ہونے کی تگ و دو میں دو بار گر پڑا، لیکن دونوں بار لڑکھڑا کر اٹھا اور کود کر اس پر چڑھ گیا۔ ایک عدد کیلواڈوس کا آرڈر دیا اور کاؤنٹر پر سر ڈال دیا۔ تمینا نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔

"کیا بات ہے مسٹر بنا کا؟" اس نے پوچھا۔

بنا کا نے آنسوؤں سے تر آنکھیں اوپر اٹھا کر اپنے سینے کی طرح اشارہ کیا، "میں کچھ بھی نہیں، سمجھیں؟ کچھ بھی نہیں۔ میرا سرے سے وجود ہی نہیں!"

وہ اٹھا اور غسل خانے چل دیا، اور وہاں سے نکلا تو بغیر پیسے ادا کیے سیدھا باہر چلا گیا۔

جب تمینا نے اس واقعے کا ذکر ہیوگو سے کیا تو اس نے کسی اخبار کا ایک صفحہ نکال کر دکھایا جس میں کتابوں پر تبصرے چھپے تھے۔ ان میں ایک بقدرِ اشکِ بلبل سا نوٹ بنا کا کی نگارشات پر بھی تھا — کل چار استہزائی سطریں، اور بس۔

بنا کا کا اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے روتے ہوئے اپنے وجودی کرب کا اظہار کرنا مجھے بے اختیارانہ گیئٹے کے *West-East Divan* کے ایک مصرعے کی یاد دلاتا ہے: "جب ساری خلقت زندہ ہو، کیا اس وقت فرد واحد بھی زندہ ہوتا ہے؟"[۷] گیئٹے کے استفسار کے پیچھے ادیب کے پورے کے پورے عقیدے کا راز ملتا ہے۔ کتابیں لکھ کر فرد ایک پوری کائنات بن جاتا ہے (ہم بالزاک کی کائنات کی بات کرتے ہیں، چیخوف کی کائنات کی بات کرتے ہیں، کافکا کی کائنات کی بات کرتے ہیں — کرتے ہیں نا؟)، اور چونکہ کسی بھی کائنات کا امتیازی وصف اس کی انفرادیت ہوتی ہے، کسی دوسری کائنات کا آس پاس وجود اس کے جوہرِ ذاتی کے لیے باقاعدہ خطرہ بن جاتا ہے۔

۷۔ "Is one man alive when others are alive?"

دو موچی آپس میں مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکتے ہیں (بشرطیکہ ان کی دکانیں ایک ہی محلے میں نہ ہوں)۔ لیکن ٹھیک جس لمحے وہ موچیوں کی قسمت پر کتابیں لکھنا شروع کردیں، ایک دوسرے کے آڑے آنے لگیں گے، انھیں فوراً یہ فکر لاحق ہو جائے گی: کیا ایک موچی کا وجود اس وقت بھی قائم رہ سکتا ہے جب بقیہ تمام موچیوں کا وجود قائم ہو؟

تمینا محسوس کرتی ہے کہ محض ایک اجنبی آنکھ اس کی ذاتی ڈائریوں کا سارا وقار غارت کر دینے کے لیے کافی ہے، جب کہ گیبٹے کے خیال میں اگر اس کے شعر کسی شخص کی نظر میں آنے سے رہ جائیں تو اس کا — گیبٹے کا — پورا وجود کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ تمینا اور گیبٹے کا فرق، انسان اور ادیب کا فرق ہے۔

کتاب لکھنے والا یا تو سب کچھ ہے (اپنے اور دوسروں کے لیے ایک پوری کائنات) یا کچھ بھی نہیں۔ اور چونکہ سب کچھ تو ایک آدمی کو ملنے سے رہا، ہم میں سے ہر کتاب لکھنے والا نتیجتاً کچھ بھی نہیں۔ نظر انداز کردہ، رقابت کی آگ میں سوزاں، شدید طور پر مجروح — ہم ابنِ آدم، اپنے ہی بھائی کی موت کی آرزو کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، اب خواہ یہ بنا کا ہو، بی بی، گیبٹے، یا میں۔

سیاست دانوں، ٹیکسی ڈرائیوروں، اسپتال میں پڑی بچے جنتی عورتوں، داشتاؤں، خونیوں، مجرموں، طوائفوں، کوتوالوں، ڈاکٹروں اور مریضوں میں گرافومیڈیا کی ریل پیل میرے لیے اس بات کا بڑے سے بڑا ثبوت ہے کہ بلا استثنیٰ ہر شخص اپنے میں ایک ادیب ہونے کا امکان مخفی رکھتا ہے۔ اور ہر کس و ناکس کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ بھاگتا ہوا سڑک پر نکل آئے اور بانگِ دہل اعلان کرے:
"ہم سب ادیب ہیں!"

اس کا سبب یہ ہے کہ ہر کسی کو اس حقیقت سے نظریں چار کرنے میں خاصی دقت ہوتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اس سرد مہر کائنات میں، بنا دوسروں کی توجہ میں آئے، بنا کچھ کہے سنے، معدوم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وقت نکل جانے سے پہلے ہی الفاظ کی ایک پوری کائنات میں اپنی تقلیب کر لے۔

جب ہر آدمی میں مستور ادیب انگڑائی لے کر معرضِ وجود میں آ جائے گا (اور وہ وقت دور نہیں) تو ہم کائناتی بہرے پن اور قلتِ تفہیم کے عہد میں پہنچ چکے ہوں گے۔

۱۹

اب لے دے کر ہیوگو ہی اس کی واحد امید رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جب دوسری بار تمینا کو شام کے کھانے پر چلنے کی دعوت دی تو وہ اس نے خوشی خوشی قبول کر لی۔

میز کے پار، اس کے عین مقابل بیٹھے ہوئے، ہیوگو صرف ایک ہی چیز کی بابت سوچ سکتا ہے: تمینا کسی طرح گرفت میں آ کر نہیں دیتی۔ سامنے ہوتی ہے تو وہ شک میں پڑ جاتا ہے اور سامنے کا وار کرنے سے ہچکچانے لگتا ہے۔ وہ جتنا کسی واجب اور معیّن چیز کے حصول کی کوشش کے خوف سے اذیت اٹھاتا ہے، اتنا ہی دنیا کو — غیر معیّن اور غیر محدود کی بے کرانی کو، اور بے کرانی کے غیر معیّن کو — فتح کرنے کی خواہش اس میں کچھ اور منہ زور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی جیب سے ایک رسالہ نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے اور تمینا کو دیتا ہے۔ جو صفحہ اس نے کھولا ہے اس پر اس کا لکھا ہوا ایک طویل مضمون ہے۔

وہ رسالے کے بارے میں پر جوش لن ترانی شروع کر دیتا ہے اور مسلسل بولے جاتا ہے: ٹھیک ہے کہ یہ رسالہ ان کے محلے کے باہر کم ہی پڑھا جاتا ہے، لیکن نظریاتی اعتبار سے اس کا شمار باحیثیت رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس کو شائع کرنے والوں میں اپنے اعتقادات کی مدافعت کرنے کی دلیری بھی پائی جاتی ہے، اور اس لحاظ سے یہ لوگ ضرور بہت کچھ حاصل کر کے رہیں گے۔ ہیوگو مسلسل تقریر کیے جاتا ہے، اس کے الفاظ شہوانی جارحیت کا استعارہ بننے، طاقت کا مظاہرہ کرنے کی جان لیوا کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں مجرد کا وہ رجھا لینے والا جوش و خروش پایا جاتا ہے جب وہ جست بھر کے مادیت کی لاطائلی میں خود کو بدل دینے کے درپے ہو۔

تمینا جوں جوں ہیوگو کے چہرے کو دیکھے جاتی ہے، اس کے خط و خال کو از سر نو ترتیب دینے لگتی ہے۔ پہلے جو صرف ایک روحانی ریاضت ہوا کرتی تھی، اب عادت سے زیادہ کوئی چیز بن گئی ہے۔ وہ کسی مرد کو کسی اور طرح دیکھنے سے عاجز ہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش کی، اپنی جملہ تخلیقی صلاحیتوں کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی، بڑے اچانک طور پر، ہیوگو کی بھوری آنکھیں واقعی نیلی ہو جاتی ہیں۔ تمینا اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمائے رکھتی ہے۔ نیلاہٹ کو زائل ہونے سے روکنے کے لیے اسے اپنی آنکھوں کی تمام تر شدت کے ساتھ اس کے چہرے پر ارتکاز کرنا ہوتا ہے۔

تمینا کی ٹکٹکی کو محسوس کر کے ہیوگو کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر بازی کی رفتار اور زیادہ تیز کر دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ بڑی دل پذیر ہے۔ اس کے بالوں کا خط کنپٹیوں کے پاس سے آہستہ آہستہ پیچھے کی سمت سمٹنے لگتا ہے تا آنکہ سامنے کے بال گھٹ کر صرف ایک تنگ سی تکون کی شکل رہ جاتے ہیں جو اس کے سر کے پیچھے، نیچے کی طرف جھکی چلی آ رہی ہو۔

''میں نے، ہماری مغربی دنیا کو ہمیشہ اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ لیکن یہاں ہمارے درمیان جو ناانصافی ہو رہی ہے، اس سے مجبور ہو کر ہم دوسرے ممالک سے غلط طور پر مروت برتنے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ تمھارا شکر، ہاں تمھارا شکر، تمینا، کہ تمھاری وجہ سے میں بالآخر یہ سمجھنے کے قابل ہو گیا ہوں کہ طاقت کا مسئلہ ہر جگہ یکساں ہے۔ تمھارے ملک اور ہمارے ملک میں، مشرق میں اور مغرب میں۔ ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ کبھی ایک طاقت کو دوسرے طاقت سے نہ بدلیں؛ ہمیں چاہیے کہ طاقت کے اصول کو بنفسہٖ مسترد کر دیں اور اس کی ہر جگہ اور ہر شکل میں پرزور نفی کریں۔''

''مطلب؟'' تمینا نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اور میں نے اس بارے میں سرے سے کبھی کوئی گفتگو ہی نہیں کی۔''

اس وقت گھٹ کر ہیوگو کی صرف ایک نیلی آنکھ رہ گئی تھی، اور وہ بھی بتدریج بھوری ہوتی جا رہی تھی۔

''تمھیں اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لیے تمھارا تصور کرنا ہی کافی تھا۔''

ویٹر نے جھک کر ان کے آگے ڈنر کا پہلا کورس لگا دیا۔

''میں گھر پر اسے پڑھوں گی،'' تمینا نے رسالے کو تھیلے میں ٹھونستے ہوئے کہا، پھر یہ اضافہ کیا، ''بی بی پراگ نہیں جا رہی۔''

''مجھے پہلے سے معلوم تھا،'' ہیوگو نے کہا۔ ''لیکن پریشان نہ ہو، تمینا میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ تمھیں یاد ہے نا؟ میں تمھاری خاطر وہاں جاؤں گا۔''

۲۰

''ایک خوش خبری سنو: میں نے تمھارے بھائی سے بات کر لی ہے اور وہ اس سنیچر تمھاری ساس

سے ملنے جارہا ہے۔"

"سچ؟ آپ نے اسے ٹھیک سے سمجھا دیا ہے نا؟ بتادیا ہے نا کہ چابی نہ ملے تو تالا توڑ دے؟"
ریسیور رکھتے رکھتے تمینا مارے خوشی کے مست ہوگئی۔

"اچھی خبر تھی؟" ہیوگو نے پوچھا۔

"ہاں،" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

وہ اس وقت بھی اپنے باپ کی بشاش اور پر جوش آواز کانوں میں سن سکتی تھی۔ وہ ناحق ہی اس سے بدگمان تھی، اس نے اپنے آپ سے کہا۔

ہیوگو اٹھ کر بار تک آیا۔ دو گلاس اٹھائے اور ان میں وہسکی ڈالی۔ "تمینا، تم جب چاہو میرے گھر سے بے تکلف پراگ فون کر سکتی ہو۔ میں ایک بار پھر وہی کہتا ہوں جو پہلے کہتا آیا ہوں: تمھارے ساتھ ہوتا ہوں تو جی کو بہت بھلا لگتا ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کبھی میرے ساتھ نہیں سوؤ گی۔"

"مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کبھی میرے ساتھ نہیں سوؤ گی" کہنے کے لیے اسے خود کو باقاعدہ مجبور کرنا پڑا تھا۔ صرف اس لیے کہ اپنے کو باور کرا سکے کہ وہ اس پر اسرار اور ناقابل حصول عورت کے مدمقابل کھڑا ہو سکتا ہے، اور اس سے بعض باتیں کہہ سکتا ہے (ہر چند کہ اسے ان باتوں کو بکمال ہوشیاری پیرایۂ نفی میں کہنا پڑا تھا)، اور خود کو تقریباً بے دھڑک محسوس کرتا ہے۔

تمینا کھڑی ہوئی، چل کر ہیوگو کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ سے وہسکی کا گلاس لے لیا۔ وہ اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آپس میں بات چیت بند ہونے کے باوجود وہ اب بھی ایک دوسرے کے دوست تھے، اور ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار۔

ہیوگو نے جام ٹوسٹ کیا: "سب بخوبی انجام کو پہنچے!" اور گلاس ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔

تمینا نے بھی اپنی وہسکی غٹاغٹ پی ڈالی اور خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ بس لوٹ کر اپنی کرسی کی طرف جانے والی تھی کہ ہیوگو نے تیزی سے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کر دیا۔

اس نے ہیوگو کی پیش قدمی کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ صرف اپنا رخ پھیر لیا۔ اس کا منھ بگڑ گیا تھا اور اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

اس نے تمینا کو اپنی آغوش میں بھر تو لیا تھا لیکن ہنوز حیران کھڑا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ اولین

چند ثانیوں تک وہ اپنی دیدہ دلیری پر سخت خائف رہا۔ اگر تمینا نے دھکا دے کر اسے اپنے سے جدا کر دیا ہوتا تو وہ نہایت بزدلی سے پیچھے ہٹ کر اس سے باقاعدہ معافی مانگنے لگ جاتا۔ لیکن تمینا نے اُسے دھکا دیا نہیں دیا۔ تمینا کے مڑے تڑے چہرے اور اپنے سے گریزاں سر کو دیکھ کر ہیوگو کی شہوت اور بھڑک اٹھی۔ اب تک جن دو چار عورتوں سے اُس کے جنسی تعلقات رہے تھے ان میں سے کسی نے بھی آج تک اس کی ملاعبت کے خلاف کسی شدید ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگر وہ پہلے سے ہی طے کر آئی ہوتی تھیں کہ اس کے ساتھ ہم بستری کریں گی، تو خود ہی کپڑے اُتار کر اطمینان سے اس کا انتظار کرنے لگتیں، تقریباً لاتعلقی کے ساتھ، کہ دیکھیں اب وہ ان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ چہرے کو بل دے کر تمینا نے اس ہم آغوشی کو وہ معنی پہنا دیے تھے جن کا وہ آج سے قبل خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دیوانہ وار اسے بھینچنے لگا اور بڑی بے تاب عجلت سے اسے برہنہ کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

لیکن تمینا نے اپنی مدافعت سے کیوں انکار کر دیا؟

مسلسل تین سال سے اسے خدشہ تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونے ہی والا ہے۔ مسلسل تین سال سے وہ اس واقعے کی ساحر، نگراں آنکھ کے نیچے رہتی آئی تھی۔ اور اب یہ آ پہنچا تھا، بعینہ اسی طرح جس طرح اس نے اس کا تصور کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی مدافعت سے انکار کر دیا اور اسے یوں قبول کر لیا جیسے کوئی ناگزیر کو قبول کرتا ہے۔

اگر وہ کچھ کر سکتی تھی تو اتنا ہی کہ اپنا سر ہیوگو کی طرف سے موڑ لے۔ لیکن اس روگردانی سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رخ پھیرتے ہی اس کے شوہر کا پیکر تمام کمرے میں اس کا پیچھا کرتا رہا۔ یہ ایک بڑے ڈیل ڈول والے شوہر کا اتنا ہی گرانڈیل اور بے ڈھنگا پیکر تھا ـــــ وہ شوہر جو زندگی سے کہیں زیادہ بڑا تھا، لیکن عین مین اسی طرح جس طرح وہ تین سال سے تصور کرتی چلی آئی تھی۔

بالآخر جب اس کا تن کپڑوں سے جدا ہوا تو ہیوگو، جو اسے جنسی طور پر مشتعل سمجھ کر شہوت کے مارے پاگل ہوا جا رہا تھا، یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ تمینا کے مخصوص نسوانی اعضا رطوبت سے عاری تھے۔

۲۱

ایک بار اسے معمولی سے آپریشن سے گزرنا پڑا تھا جس میں اعضا کو سن کرنے والی دوا استعمال

نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ درد کی شدت اور کاٹ سے توجہ ہٹانے کے لیے وہ آپریشن کی پوری مدت مجبوراً انگریزی کے بے قاعدہ افعال (irregular verbs) کی گردان کرتی رہی تھی۔ اس بار بھی اس نے یہی نسخہ آزمانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی ساری توجہ ان نوٹ بکس پر مرکوز کر دی، اس بات پر کہ عنقریب وہ بحفاظت اس کے باپ کی تحویل میں چلی آئیں گی، اور یہ کریم آدمی ہیوگو وہاں جا کر انھیں اس کے لیے لے آئے گا۔

کریم آدمی ہیوگو نہایت تیزی اور دیوانگی سے کچھ دیر تک اپنے کام میں لگا رہا، تا آنکہ تمینا کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے بازوؤں کے بل اٹھ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر اپنے کولھے ہر سمت میں جھاڑ پٹک رہا ہے۔ تمینا نے اندازہ کر لیا کہ وہ اس کے جنسی ردِعمل سے غیر مطمئن ہے، اور اس کی شہوت کو اپنے حسبِ ضرورت برانگیختہ نہ پا کر ہر ممکن زاویے سے اس میں دخول کی کوشش کر رہا ہے، کہ کسی طرح اثر پذیری کے اس مقام کو جا لے جو وہ کہیں دور اپنے جسم کی گہرائیوں میں اس سے رو کے ہوئے ہے۔

تمینا کو اس کی قیامت کی دشوار گذار کوششوں کو دیکھنے کی چنداں خواہش نہ تھی۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر اپنا سر ہیوگو کی طرف سے پھیر لیا۔ اپنے خیالات کو مجتمع کر کے ایک بار پھر نوٹ بکس پر مرتکز ہونے کی کوشش کی۔ خود کو مجبور کیا کہ شوہر کے ساتھ گزاری ہوئی چھٹیوں کی اس ترتیب کا جائزہ لے جو اس کی یادداشت نے، ہر چند نامکمل سہی، از سرِ نو منظم کی تھی: پہلی جو بوہیمیا میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے گزاری گئی تھیں، پھر یوگوسلاویہ والی، پھر بوہیمیا کی ایک اور جھیل والی، اس کے بعد وہ جو کسی معدنی چشمے پر گزاری گئی تھیں ـــــ لیکن ترتیب ہنوز غیر واضح تھی۔ ۱۹۶۴ء میں دونوں تترس گئے تھے، اور اس سے اگلے سال بلغاریہ، لیکن اس کے بعد ہر چیز خلط ملط ہو جاتی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں انھوں نے اپنی ساری چھٹیاں پراگ ہی میں بتائی تھیں، اس سے اگلے سال وہ معدنی چشمے پر گئے تھے، اور اس کے بعد ہجرت کر کے یہاں چلے آئے تھے اور اپنی آخری تعطیلات اٹلی میں منائی تھیں۔

ہیوگو نے اپنا جسم اس سے علیحدہ کر لیا اور اس کے جسم کو پلٹانے کی کوشش کی۔ تمینا نے اندازہ کر لیا کہ وہ چاہتا ہے تمینا جانوروں کی طرح گھٹنوں اور کہنیوں کے بل ہو جائے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ہیوگو عمر میں اس سے چھوٹا ہے، اور وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے جذبات مار کر پوری

لاتعلقی سے خود کو ہیوگو کے سپرد کر دیا۔ اُس نے ہیوگو کے جسم کے ناہموار دھکوں اور رگڑوں کو اپنی پشت پر محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے اپنی بے پناہ قوت باہ اور قوتِ برداشت سے خیرہ کرنے کے درپے ہو، گویا ایک فیصلہ کن جنگ لڑ رہا ہو، اپنا امتحان لے رہا ہو، یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ وہ انجام کار اسے مغلوب کرنے پر قادر ہے اور اس کے لائق ہے۔

اسے پتا نہیں تھا کہ ہیوگو اسے دیکھنے سے قاصر ہے۔ تمینا کی پشت پر نظر ڈالتے ہی (اس کے حسین، بالغ کولھوں کی اس کھلی ہوئی آنکھ پر جو اسے ترحم سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی) اس کی شہوت اتنی بھڑک اٹھی کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اپنے دھکوں کی مجنونانہ رفتار کو لگام دی، اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اب وہ بھی اپنے ذہن کو کسی اور چیز (وہی ایک چیز جو دونوں میں مشترک تھی) پر مرتکز کرنے اور جنسی فعل کو کچھ دیر اور جاری رکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

اسی اثنا میں تمینا کو ہیوگو کے کمرے کی سفید دیوار پر اپنے شوہر کا بڑا سا چہرہ نظر آیا، اور اس نے مضبوطی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار پھر وہ بے قاعدہ افعال کی گردان کی طرح ان چھٹیوں کو دہرانے لگی: جھیل کے کنارے گزاری گئیں پہلی چھٹیاں، پھر یوگوسلاویہ، اور جھیل؟ —— پھر تترس والی، پھر بلغاریہ والی، اس کے بعد ہر چیز مبہم ہوگئی تھی، پھر پراگ، معدنی چشمہ اور آخر اٹلی۔

ہیوگو کی گہری گہری سانسوں کی آواز اسے اپنی یادوں سے کھینچ لائی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دیوار پر اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

ٹھیک اسی لمحے ہیوگو نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں، اور تمینا کی پشت میں جڑی ہوئی اس بے پناہ آنکھ کو دیکھتے ہی جنسی وجد کی ایک زبردست لہر ایک کوندے کی طرح اس کے سارے جسم میں لپک گئی۔

۲۲

جب تمینا کا بھائی اس کی ساس سے ملنے گیا تو اسے دراز کا تالا توڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ دراز پہلے سے کھلی ہوئی تھی، اور اس میں گیارہ کی گیارہ نوٹ بکس موجود تھیں۔ لیکن وہ بنڈل میں بندھی ہوئی نہ تھیں بلکہ منتشر تھیں۔ خطوط بھی اسی طرح بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے —— کاغذات کا ایک بے شکل انبار۔ تمینا کے بھائی نے اس ملبے کو سوٹ کیس میں بھرا اور باپ کو دے آیا۔

تمینا نے فون پر اپنے باپ سے کہا کہ ساری چیزوں کو قرینے سے کاغذ میں لپیٹ کر اسے احتیاط سے چاروں طرف سے باندھ دے، اور ــــ اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ ــــ اس نے نہایت عاجزی سے درخواست کی کہ نہ وہ اور نہ اس کا بھائی ان کا ایک لفظ پڑھیں۔

اس نے تمینا کو اطمینان دلایا، حالانکہ اس بات کا وہ تقریباً برا مان گیا کہ وہ کبھی اپنے خواب میں بھی تمینا کی ساس کے نقش قدم پر چل کر ان چیزوں کو پڑھے گا جن سے اس کا کوئی سروکار نہ ہو۔ لیکن مجھے معلوم ہے (اور تمینا کو بھی معلوم ہے) کہ بعض چیزیں ہوتی ہی ایسی ہیں کہ آدمی انھیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا ــــ مثلاً جیسے کار کا حادثہ یا دوسروں کے عشقیہ خطوط۔

چنانچہ، انتہائے کار، تمینا کی بہت ہی بے تکلفانہ اور نجی تحریریں اب اس کے باپ کی حفاظت میں تھیں۔ لیکن کیا اس کے لیے ان کی اب بھی وہی قدر و قیمت تھی؟ کیا وہ پہلے ہی سینکڑوں بار یہ نہ کہہ چکی تھی کہ اغیار کی نگاہ اس بارش کی طرح ہوتی ہے جو لکھے کو دھو ڈالتی ہے؟

بات یہ ہے کہ اس معاملے میں وہ غلطی پر تھی۔ وہ تو انھیں دیکھنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ تڑپ رہی تھی۔ ان کی اہمیت اس کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ پامال اور بے حرمت کی جا چکی تھیں۔ وہ اور اس کی یادیں ایک مشترکہ قسمت میں ایک دوسرے کی بہنیں تھیں۔ ان سے اس کی محبت اور بھی بڑھ گئی۔

لیکن اس کے باوجود وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اسے باقاعدہ ذلیل، باقاعدہ سبک سر کیا گیا ہے۔

ایک بار بہت پہلے ــــ جب اس کی عمر سات سال کے لگ بھگ تھی ــــ اس کا چچا اس کے کمرے میں ٹھیک اس وقت در آیا تھا جب وہ برہنہ تھی۔ اسے بے حد شرم آئی۔ پھر یہی ندامت سرکشی میں تبدیل ہوگئی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے خود سے طفلانہ لیکن باضابطہ عہد کر ڈالا کہ اپنی مدت العمر کبھی اس چچا کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ وہ جب بھی ان کے یہاں آتا، وہ اسے دیکھنے سے انکار کر دیتی، اور اس کے لیے اسے ہر جور و ستم منظور تھا: گھر والوں کی تہدید، ڈانٹ پھٹکار، چیخنا چلانا، طنز، استہزائی ہنسی ــــ سب کچھ۔

اور اب یہاں ایک ملتی جلتی صورت حال سے سامنا تھا۔ وہ اپنے والد اور بھائی کی شکر گزار تھی

لیکن وہ اب دوبارہ کبھی ان کا منھ تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ آج یہ بات اس پر پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو چکی تھی: وہ کبھی لوٹ کر ان کے پاس نہیں جائے گی۔

۲۳

ہیوگو کی غیر متوقع کامیابی اپنے ساتھ اتنی ہی پسپائی بھی لیتی آئی تھی۔ ہر چند وہ اب جب چاہتا اس کے ساتھ ہم بستری کر سکتا تھا (پہلی دفعہ سپرد کر دینے کے بعد اب وہ شاید ہی انکار کر سکتی تھی)، لیکن اسے خوب احساس تھا کہ وہ اسے اپنا بنانے، اسے خیرہ کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ ایک برہنہ جسم اس کے جسم کے نیچے اس قدر لاتعلق، اتنا سرد مہر، اتنا نارسا، اتنا اجنبی کیسے ہو سکتا ہے؟ اور وہ بھی اس وقت جب وہ اسے اپنی اندرونی زندگی کا حصہ بنانے کا شیدائی تھا! اس پرشکوہ کائنات کا حصہ جس کی تجسیم اس کے گرم لہو اور خیالات سے ہوئی تھی!

''تمینا، میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں،'' ریستوراں میں اس کے مقابل بیٹھے ہوئے اس نے کہا۔ ''محبت کے بارے میں کتاب۔ ہاں، ہاں، تمھارے بارے میں، اپنے بارے میں، ہمارے بارے میں، ہمارے نجی ترین جذبوں کے بارے میں۔ ڈائری کی صورت، ہمارے دو جسموں کی ڈائری۔ ہاں، ہاں، میں تمام پابندیوں کو جھاڑ کر بالکل بے لاگ طور پر یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب سیاسی بھی ہوگی۔ محبت کے بارے میں ایک سیاسی کہانی اور سیاست کے بارے میں ایک محبت کی کہانی...''

تمینا وہیں بیٹھی اسے دیکھے جاتی ہے۔ اچانک اس کے چہرے کی کیفیت ہیوگو سے اور برداشت نہیں کی جاتی اور وہ اپنی گفتگو کا سلسلہ کھو بیٹھتا ہے۔ وہ تو اسے اپنے لہو اور خیالات کی کائنات میں اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا، اور وہ یہاں اپنی ہی دنیا میں سراسر اور یوں مکمل محو بیٹھی تھی۔ اس کے الفاظ بہرے کانوں میں پڑنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنی روانی کھو کر بوجھل ہوتے جا رہے تھے: ''...سیاست کے بارے میں ایک محبت کی کہانی۔ بالکل — کیونکہ ہمیں جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسانی پیمانے پر ایک دنیا تخلیق کر سکیں، اپنے پیمانے پر، اپنے جسموں کے پیمانے پر۔ تمھارا جسم، تمینا، اور میرا جسم، بالکل۔ تاکہ آدمی بوس و کنار کا ایک نیا طریقہ دریافت کر سکے، محبت کرنے کا ایک نیا ڈھنگ...''

الفاظ اور زیادہ بوجھل اور بے ڈھب ہوتے جارہے ہیں، وہ کچّے گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہیں۔ ہیوگو کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ تمینا حسین ہے، اور وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اپنے بے وطن بیوہ کے ماضی کو استعمال کر رہی ہے، اور اپنی جھوٹی انا کی فلک بوس عمارت کی بلندی سے نیچے ہر ایک کو حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ ہیوگو رشک کے ساتھ خود اپنی لاٹ کے بارے میں سوچتا ہے، وہ لاٹ جو وہ تمینا کی فلک بوس عمارت کے درمیانی فاصلے کو پاٹنے کے لیے کھڑی کرنا چاہتا ہے، وہ لاٹ جس پر تمینا ذرا سی توجہ دینے کے لیے بھی آمادہ نہیں —— وہ لاٹ جو محض ایک مطبوعہ مضمون اور اپنی اور اس کی محبت کے بارے میں ایک مجوزہ کتاب سے مل کر بنی ہے۔

''تم پراگ کب جارہے ہو؟'' تمینا پوچھتی ہے۔

ہیوگو پر منکشف ہوتا ہے کہ تمینا نے کبھی اس سے محبت نہیں کی اور وہ ہیوگو کے ساتھ محض اس لیے چلی آئی ہے کہ اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کے لیے پراگ جا سکے۔ ہیوگو بدلہ لینے کی ناقابلِ مزاحمت خواہش سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ ''میرا خیال تھا کہ اب تک تم خود ہی سب کچھ سمجھ چکی ہوگی۔ تم نے میرا مضمون پڑھا ہے —— پڑھا ہے نا؟''

''ہاں پڑھا ہے،'' وہ جواب دیتی ہے۔

اسے تمینا پر بالکل یقین نہیں آتا۔ اور اگر بفرضِ محال پڑھ بھی لیا ہے تو یہ طے ہے کہ وہ اس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی ہے۔ ہیوگو کو محسوس ہوتا ہے کہ اس موقعے پر وہ واحد عظیم جذبہ جو وہ مہیا کر سکتا ہے وہ اپنی لاٹ سے وفاداری کا جذبہ ہی ہے، وہ لاٹ جس کی قدر شناسی نہیں ہوئی ہے، جس سے روگرداں ہوا گیا ہے (یعنی صرف ایک مطبوعہ مضمون اور تمینا اور اپنی محبت کے بارے میں ایک مجوزہ کتاب پر اٹھی ہوئی لاٹ)، اور وہ اس لاٹ کی بے حرمتی کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑنے، تمینا سے اس کے وجود کا اقرار کروا لینے، اور اس کی بلندی سے اسے متحیر کرنے کے لیے آمادہ ہے۔

''اگر پڑھ لیا ہے تو جان گئی ہوگی کہ اس کا موضوع بحث 'طاقت' ہے۔ میں نے طاقت کی مشینری کا تجزیہ کیا ہے۔ آج جو کچھ تمھارے ملک ہو رہا ہے، میں نے اس کا حوالہ دیا ہے اور میں نے بات چبا چبا کر نہیں کی۔''

''تو تم سچ مچ یہ سمجھتے ہو کہ پراگ والوں کو تمھارے مضمون کی خبر ہے؟''

اس طنز سے ہیوگو مجروح ہو جاتا ہے۔ ''تم ایک مدت سے ملک کے باہر رہ رہی ہو۔ تمھیں اب یہ یاد نہیں رہا کہ تمھاری پولیس ان معاملات میں کہاں تک جا سکتی، کیا کچھ کر سکتی ہے۔ وہاں اس مضمون کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں وہاں سے بہت سے خطوط بھی آئے ہیں۔ تمھاری پولیس میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔''

تمینا کوئی جواب نہیں دیتی۔ بس وہاں بیٹھی کچھ اور زیادہ حسین نظر آنے لگتی ہے۔ خدایا! اگر وہ اس کی کائنات کو ذرا بھی پہچان لے۔۔۔ وہ کائنات جس میں وہ اسے اٹھا لے جانے کا آرزومند ہے، جو اس کے گرم لہو اور خیالوں سے مرتب ہوئی ہے۔۔۔ تو وہ ایک کیا، سو بار بھی پراگ آنے جانے کے لیے تیار ہو جائے گا! اور اچانک اس کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ ''تمینا'' وہ اداسی سے اسے مخاطب کرتا ہے، ''مجھے معلوم ہے کہ تم میرے پراگ نہ جانے سے ناخوش ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس مضمون کی اشاعت کو کچھ اور مدت کے لیے ملتوی کردوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ان محسوسات کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔۔۔ سمجھیں؟''

''نہیں،'' تمینا جواب دیتی ہے۔

ہیوگو کو خوب معلوم ہے کہ اس کی ہر بات نہایت مضحکہ خیز ہے اور اسے وہاں لے جا سکتی ہے جہاں جانے کی اسے ذرا خواہش نہیں۔ لیکن اب وہ مورچہ چھوڑ کر پیچھے بھی تو نہیں ہٹ سکتا۔ اس خیال سے وہ پاگل پن کی حد تک مایوس ہوا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے سرخ دھبے پت کی طرح نکل آتے ہیں، اور اس کی آواز بانس کی طرح پھٹنے لگتی ہے۔ ''تو تم نہیں سمجھیں؟ اچھا لو، میں سمجھائے دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں بھی چیزوں کا وہی حشر ہو جو وہاں ہوا ہے! اگر ہر فرد و بشر ان معاملات کو یوں ہی تھوڑی دیر کے لیے التوا میں ڈالتا گیا تو ہم پلک جھپکتے میں یہاں بھی غلام بن چکے ہوں گے۔''

کراہت کی ایک شدید لہر اٹھی اور تمینا کو مغلوب کر گئی۔ وہ اپنی کرسی سے کود کر اتری اور عورتوں کے غسل خانے کی طرف بھاگی۔ اس کی آنتیں ابل کر اس کے حلق میں چلی آ رہی تھیں۔ وہ ٹائلیٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور قے کر دی۔ اس کا پورا جسم یوں تڑپ اور لرز رہا تھا گویا سسکیاں بھر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے اس لونڈے کے خصیوں، عضوِ تناسل اور زیرِ ناف کے بالوں کی تصویر تھی۔

وہ اس کے منہ سے نکلتی ہوئی سانسوں کی کھٹی بساند سونگھ سکتی تھی، اور اپنے کولھوں پر اس کی رانوں کے دباؤ کو محسوس کر سکتی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اب اسے مطلق یاد نہیں رہا کہ اس کے شوہر کے اعضائے تولید کی کیا شکل وصورت تھی — دوسرے لفظوں میں، کراہت کی یاد شفقت اور ملائمت کی یاد سے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہو رہی تھی (خدایا، ہاں، کراہت کی یاد شفقت اور ملائمت کی یاد سے کہیں زیادہ طاقتور ہے) — اور وہ دن دور نہیں جب اس کے حافظے میں صرف یہ لڑکا اور اس کے منہ سے اٹھنے والے بدبو کے بھبھاکے ہی رہ جائیں گے۔ اور اس نے پھر قے کر دی۔ شاخِ بید کی طرح لرزی، تڑپی، اور ایک اور قے کر دی۔

جب وہ غسل خانے سے برآمد ہوئی تو اس کے منہ پر (جو ہنوز اس کھٹی بو سے لبریز تھی) ہمیشہ کے لیے خاموشی کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔ ہیو گو مضطرب و خجل تھا۔ چاہتا تھا کہ ساتھ چل کر اسے گھر تک چھوڑ آئے، لیکن وہ ایک لفظ بولنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ سِل چکے تھے (جس طرح خواب میں ہوا تھا، جب اس کے منہ میں طلائی انگشتری تھی)۔

جب وہ اس سے بولا تو اس کا تنہا ردِعمل یہ تھا کہ وہ اور زیادہ تیز چلنے لگی۔ جلد ہی اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہ گیا، اور کچھ دیر تک وہ اس کے ساتھ ساتھ خاموش چلتا گیا۔ بالآخر وہ ایک جگہ رک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سیدھی آگے چلتی گئی، بغیر اِدھر یا اُدھر دیکھے ہوئے۔

وہ اپنی مدتِ عمر گاہکوں کو کافی پیش کرتی رہی اور بھول کر بھی دوبارہ چیکوسلوواکیہ فون نہ کیا۔

❄

میلان کنڈیرا

❄

گرانڈ مارچ

ذیل میں کنڈیرا کے ناول ''وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت'' (The Unbearable Lightness of Being) کے چھٹے حصے کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پورا ناول ہی اردو میں منتقل کیے جانے کے قابل ہے۔ شاید کوئی ادبی دلیر اس کارِ ثواب کی طرف متوجہ ہو جائے۔

کنڈیرا نے اپنی بعض تحریروں میں سیاست، ادب، ادبی تنقید، خصوصاً ناول کی ہیئت، کے بارے میں اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ صاحبِ نظر قاری اس موقف کی آنچ ''گرانڈ مارچ'' (Grand March) والے حصے میں بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ سیاسی واقعات سے مجروح زندگی کے شائستہ ادبی اظہار کے لیے لکھنے والے کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کا شاہکار یہ ناول ہے۔ لوگ جذبے کے ہیجان اور اپنے اخلاص کی فراوانی ہی کو ادبی نگارش کی کامیابی کا پیمانہ سمجھ لیتے ہیں۔ اب وہ کنڈیرا کے ''اخلاص'' کا لطف بھی لیں۔ مجال ہے کہ اس نے ادبی اصولوں کو ''اخلاص'' کے نام پر قربان کیا ہو؛ مجال ہے جو ادبی اصول کسی مرحلے پر ''اخلاص'' سے رسہ تڑا کر فرار ہوئے ہوں۔ ''اخلاص'' زندگی کے بارے میں بنا کسی تعصب کے غور کرنے سے آتا ہے۔

خیر یہ سب تو ہے ہی۔ مجھے یہ ناول ایک اور وجہ سے بھی پسند ہے۔ یہ کنڈیرا کے تصورِ ناول کا مکمل ترین اور خوشنما ترین عملی پیراہن ہے۔ ملاحظہ ہو کہ کس سفاکی سے قصے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے، اور پھر کس شفقت سے اس انتشار کی شیرازہ بندی کی ہے۔ بظاہر ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے باوجود، اپنی اپنی جگہ قائم بالذات ہونے کے باوجود، یہ ٹکڑے ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔ یہاں تکرار مجذوب کی بڑ نہیں، بلکہ شے کے قعرِ احساس میں مخفی ابعاد کی بازیافت کی جستجو ہے۔ دیکھیے زمانی تسلسل کے انقطاع کے باوصف، موضوع کی وحدت اور ارتکاز کہیں پراگندہ نہیں ہونے پایا۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اس میں پھسپھسی، چیستانی گراں باری کا شائبہ تک نہیں جس کی بدہضمی سے ان دنوں ہمارا ''بے حد جدید'' اردو فکشن قے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات: گو کنڈیرا کی زبان ''شاعری'' کو نہ پہنچ سکی ہو، بڑے بے محابا اور براہِ راست ارتکاز سے ہمارے احساس اور شعور میں ضرور جاگزیں ہو جاتی ہے۔ یہ

ایک discourse ہے، جملہ انسانی صورت حال پر، لیکن ان میں رسمی فلسفے کی گراں باری اور افلاطونی پیچیدگی نہیں آنے پائی۔ یہاں تو وہ عمل ملتا ہے جس کے ذریعے مجرد خیال کی حقیقت میں تجسیم ہوتی ہے۔ ہم لوگ حقیقت کو خواب بنانے کی تگ و دو میں ہیں۔ شاید اس لیے کہ خواب کا انتشار ہمارے وجدان اور فکر کی شکستگی کو اپنی مبہم فضا کی رحم مادر میں بہ کمال شفقت حمائل کرنے کا مجاز تصور کیا جانے لگا ہے، اور شاید اس لیے بھی کہ یہ حربہ ہمیں ادیب بنائے یا نہ بنائے، کم از کم جسم پر کھال ضرور سلامت رہنے دیتا ہے۔

یہاں یہ ذکر شاید بے محل نہ ہو کہ کنڈیرا fable، parable، allegory اور اس قسم کی دوسری اصناف کو، جو "سریات" (esoterica) میں شمار کی جاتی ہیں، فکشنی ادب کے حق میں مہلک سمجھتا ہے۔ مثلاً "تمثیل" (یا ایلی گری) کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ "محض کسی مفروضے کی تشریح کے واسطے گھڑی گئی کہانی" ہوتی ہے؛ جب کہ واقعات کو، خواہ وہ حقیقی ہوں یا خیالی، فی نفسہٖ اہم ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سیاسی بحران اور آمریت کے دور میں ادبی رجحان کچھ زیادہ ہی "تجرید" پسند ہو جاتا ہے، لیکن میلان کنڈیرا کے ناولوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس قسم کی ناپسندیدہ تجریدیت سے دامن بچا کر چلنے کا امکان، بہر حال، موجود ہے۔

اوپر انتشار اور پھر ماہرانہ شیرازہ بندی کا ذکر آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے سات حصوں میں سے ہر حصہ (جو خود چھوٹے چھوٹے بیس تیس ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے) اپنی جگہ مکمل ہے اور اپنی اس آزاد حیثیت کے باوجود ناول کا جزوِ لاینفک بھی۔ بہر حال، آپ اس حصے کو ایک مکمل کہانی پائیں گے۔

—— مترجم

❄

۱

یہ تو ہمیں ۱۹۸۰ء میں کہیں جا کر "سنڈے ٹائمز" کے مطالعے سے پتا چلا کہ اسٹالن کے بیٹے یاکوف (Yakov) کی موت اصلاً کن حالات میں واقع ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جرمنوں کے

ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد اسے ایک کیمپ میں برطانوی آفیسروں کے ایک گروہ کے ساتھ ڈال دیا گیا تھا۔ ان سب کے استعمال کے لیے بس ایک ہی پاخانہ تھا۔ اسٹالن کے بیٹے کی عادت تھی کہ رفع حاجت کے بعد پیچھے نہایت متعفن غلاظت چھوڑ جاتا تھا۔ برطانوی آفیسروں کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ ان کے پاخانے میں جابجا فضلہ لتھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ یہ فضلہ دنیا کے قوی ترین آدمی کے سپوت کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں یاکوف سے بات کی۔ وہ برا مان گیا۔ انھوں نے بار بار اس طرف اس کی توجہ دلائی، اور اس سے پاخانہ صاف کرانے کی کوشش کی۔ وہ مارے غصے کے ابل پڑا، بحثا بحثی کرنے لگا، اور باقاعدہ لڑ پڑا۔ آخرکار، اس نے کیمپ کے کمانڈر سے شنوائی کا مطالبہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ معاملے میں کمانڈر ثالث بنے۔ لیکن اس مغرور کمانڈر نے فضلے کی بابت گفتگو کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسٹالن کا بیٹا اس ہزیمت کو برداشت نہ کر سکا۔ آسمان کو حاضر ناظر بنا کر اس نے قبیح ترین روسی مغلظات زبان سے نکالے، اور جست بھر کر کیمپ کے احاطے کی برقی خاردار چہار دیواری کی طرف دوڑ لگا دی۔ تیر بہ ہدف لگا۔ اس کا جسمِ عزیز، جو برطانویوں کے پاخانے کو اب کبھی گندا نہ کر سکے گا، تار سے چپک کر رہ گیا۔

اسٹالن کے بیٹے کی زندگی عذاب اور آزمائش ہی میں گزری۔ تمام شواہد اسی طرف دلالت کرتے ہیں کہ اس کے باپ نے اس عورت کو مار ڈالا تھا جس کے بطن سے یاکوف پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ ننھے اسٹالن میاں دونوں ہی تھے: پسرِ خدا بھی (کیونکہ ان کے باپ کی اتنی ہی تعظیم کی جاتی تھی جتنی خدا کی) اور راندۂ خدا بھی۔ لوگ اس سے دوہرے طور پر خوف زدہ رہتے۔ وہ انھیں اپنے غیظ و غضب سے (کہ بہر حال تھا تو وہ اسٹالن کا سپوت ہی) ایذا پہنچا سکتا تھا، بعینہٖ جس طرح اپنے لطف و کرم سے (کہ اُس کا باپ اس کی گوش مالی کرنے کے چکر میں اس کے یار دوستوں کی مرمت ہی نہ کر دے)۔

ردّ اور رعایت، خوشی اور غم ـــ یاکوف سے زیادہ کوئی اور شخص اتنے حقیقی طور پر نہیں محسوس کر سکتا تھا کہ متضاد چیزیں کس آسانی سے ایک دوسرے میں تبادل پذیر ہو سکتی ہیں، کہ انسانی وجود کے ایک عمود سے دوسرے عمود کا فاصلہ کس قدر مختصر ہو سکتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ جنگ کے عین آغاز میں وہ جرمنوں کی قید میں جا پھنسا جہاں دوسرے قیدیوں نے، جو ایک ناقابلِ فہم طور پر نک چڑھی قوم سے تھے جس سے وہ اندرونی طور پر متنفر تھا، اس پر غلیظ اور

ملیچھ ہونے کا بہتان لگایا۔ تو کیا اب اسے، جس کے شانوں پر اعلیٰ ترین ڈرامے کا بوجھ تھا (بحیثیت پسرِ خدا، باعتبار فرشتۂ مہبوط)، مقدمے کی ذلت بھی اٹھانی پڑے گی، اور وہ بھی کسی برتر اور منزہ چیز کے حوالے سے نہیں (مثلاً جو خدا اور ملائک کے دائرے میں آتی ہو)، بلکہ فضلے کے حوالے سے؟ تو کیا اعلیٰ ترین ڈرامہ اور اسفل ترین ڈرامہ ایک دوسرے سے اس درجہ قریب تھے کہ سر چکرا جائے؟

سر چکرانے کی حد تک قریب؟ کیا قربت سر چکرا دیتی ہے؟

بالکل۔ جب قطبِ شمالی قطبِ جنوبی کے اس قدر قریب آ جائے کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکے، تو دنیا غائب ہو جاتی ہے اور آدمی خود کو ایسے خلا میں پاتا ہے جو اس کا سر چکرا دیتا ہے اور چھلانگ لگا دینے کا اشارہ کرتا ہے۔

اگر رد اور رعایت ایک ہی چیز ہیں، ارفع اور ادنیٰ میں کوئی فرق نہیں، اور پسرِ خدا پر فضلے کے حوالے سے مقدمہ چلایا جا سکتا ہے، تو اس صورت میں وجودِ انسانی اپنے ابعاد سے تہی ہو کر ناقابلِ برداشت طور پر لطیف ہو جاتا ہے۔ جس وقت اسٹالن کے بیٹے نے دوڑ لگا کر خود کو برقی تار پر دے پھینکا تھا، تو وہ خاردار جنگلہ ترازو کے پلڑوں کی طرح تھا جو دردانگیز طور پر ہوا میں اٹھے ہوئے ہوں، ایسی دنیا کی لامتناہی لطافت کے دوش پر جو اپنے ابعاد سے تہی ہو چکی ہو۔

اسٹالن کے بیٹے نے فضلے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ لیکن فضلے کی خاطر جان دے دینا قطعی بے معنی موت نہیں ہے۔ ہاں، اب اگر جرمنوں نے اپنے ملک کی حدود کو مشرق کی طرف بڑھانے میں جان دے دی، اور روسیوں نے اپنے دائرۂ اقتدار کو مغرب کی طرف توسیع دینے میں، تو یہ البتہ ضرور ایک احمقانہ چیز کے حصول کی راہ میں جان دینے کے مترادف تھا۔ ان کی موت کے کوئی معنی نہیں نکلتے، اور نہ اس موت کی عام افادیت کا کوئی جواز ہی نظر آتا ہے۔ جنگ کی عام حماقت میں صرف اسٹالن کے فرزند کی موت ہی کو مابعد الطبیعیاتی موت ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

۳

لڑکپن میں جب میں اس "عہد نامۂ عتیق" کی ورق گردانی کرتا جو خاص طور پر بچوں کے لیے مرتب کیا گیا تھا، اور جس کی تصویریں گستاف دورے (Gustave Dore) کی کندہ کاریوں

(engravings) سے لی گئی تھیں ـــــ تو اللہ میاں مجھے بادل پر کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ ایک بوڑھے آدمی تھے جن کی آنکھیں تھیں، ناک تھی، اور ایک لمبی داڑھی تھی۔ میں اپنے سے کہتا کہ اگر ان کا منھ ہے تو یہ کھانا بھی ضرور کھاتے ہوں گے۔ اور اگر یہ کھانا کھاتے ہیں تو ان کی آنتیں بھی ہوں گی۔ لیکن اس خیال سے مجھے ہمیشہ ہی ہول چڑھنے لگتا۔ اس کے باوجود کہ جس خاندان سے میرا تعلق تھا وہ کوئی ایسا خاص مذہبی نہ تھا، خدا کے ساتھ آنتوں کا تصور مجھے بڑی بے حرمتی کی بات محسوس ہوتی۔

کمال برجستگی سے، بنا دینیات کی رسمی تعلیم کے، میں نے، جو ابھی بچہ ہی تھا، یہ دریافت کر لیا تھا کہ خدا کے ساتھ فضلے کا کوئی جوڑ نہیں۔ اس طرح عیسائی علمِ بشریت کا بنیادی مفروضہ ہی میری نظر میں قابلِ استفسار ٹھہرا: یہی کہ آدمی کی تخلیق نقشِ خدا پر ہوئی ہے۔ مسئلہ اگر یہ یا اگر وہ کا تھا۔ یا تو یہ تھا کہ آدمی خدا کی شبیہہ میں بنایا گیا تھا ـــــ اور خدا کی آنتیں ہیں! ـــــ یا خدا کی آنتیں نہیں، اور آدمی خدا کی طرح نہیں۔

قدیم گیانیوں [1] کے محسوسات بالکل وہی تھے جو پانچ سال کی عمر میں میرے تھے۔ دوسری صدی کے جید غناسطی عارف ولن تی نس (Valentinus) نے اس قابلِ نفریں مخمصے سے نکلنے کا حل کچھ اس دعوے کی صورت میں پیش کیا تھا کہ یسوع مسیح ''کھاتے بھی تھے اور پیتے بھی تھے، لیکن رفع حاجت نہیں کرتے تھے۔''

شر کے مقابلے میں فضلہ دینیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ چونکہ خدا نے آدمی کو اختیار دیا ہے چنانچہ عندالحاجت ہم یہ بات بھی قبول کر سکتے ہیں کہ وہ آدمی کے مرتکبہ جرائم کا ذمے دار نہیں۔ اس کے برخلاف، فضلے کی تمام تر ذمے داری اس کے سر ہے، یعنی اسی کے سر جو آدمی کا خالق ہے۔

۴

چوتھی صدی میں سینٹ جروم (Saint Jerome) نے باغ فردوس میں آدم اور حوا کی جنسی مباشرت کا قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔ اس کے برخلاف، نویں صدی کے عظیم عالمِ دینیات یوہانس اسکوٹس اری جینا (Johannes Scotus Erigena) نے اس نظریے کو قبول کیا۔ یہی نہیں، اس کا

۱۔ Gnostics: غناسطی، عارفین، علمِ باطنی رکھنے والے۔

عقیدہ تھا کہ آدم کا عضوِ تناسل اپنے مالک کے ادنیٰ سے اشارے پر، جب اور جس طرح چاہے، بازو اور ٹانگ کی طرح اٹھ بھی سکتا ہے۔ اب صاحب، ہم اس تصور کو کسی ایسے آدمی کے مکرر الوقوع خواب سے تعبیر کر کے نہیں ٹال سکتے جسے نامردی کے خوف نے ایک آسیب کی طرح آلیا ہو۔ اری جینا کا مدعا کچھ اور ہی ہے۔ سوچیے تو سہی، اگر عضوِ تناسل کو محض ایک حکم کے ذریعے ایستادہ کیا جا سکے تو پھر شہوت اور جنسی اشتعال کا قصہ ہی پاک ہو جاتا ہے۔ اس عضو کی ایستادگی ہمارے جنسی اشتعال کی رہینِ منت نہیں رہے گی۔ بلکہ ہمارے حکم کی۔ تو اس ثقہ عالمِ دینیات کے حساب سے جو چیز جنت سے لگا نہیں کھاتی، وہ جنسی مباشرت اور اس سے آنے والا مزہ نہیں، بلکہ شہوت اور جنسی برانگیختگی ہے۔ خوب ذہن نشین کر لیجیے: جنت میں عیش و عشرت تو تھا، شہوت نہیں۔

اری جینا کی دلیل فضلے کی دینیاتی تائید (بالفاظ دیگر تھیوڈسی)[1] کے مسئلے میں کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ آدمی کو جب تک جنت میں رہنے کی اجازت تھی تو یا وہ (ولن تی نس کے مسیح کی طرح) بالکل ہی رفع حاجت نہیں کرتا تھا، یا (اور یہ اغلب ہے) اپنے فضلے کو کوئی مکروہ یا ناگوارِ خاطر چیز نہیں گردانتا تھا۔ جنت سے نکال باہر کرنے کے بعد ہی کہیں جا کر خدا نے آدمی میں احساسِ کراہت کو جنم دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی ہر اس چیز کی پردہ پوشی کرنے لگا جو اس کے احساسِ ندامت کو ابھارتی تھی۔ تا آنکہ جب وہ بالکل ہی بے حجاب ہوا، ایک خیرہ کن روشنی اس کی قوتِ بینائی سلب کر چکی تھی۔ انجام کار، تنفر اور کراہت سے متعارف ہونے کے فوراً بعد وہ شہوت سے بھی متعارف ہو گیا۔ فضلے کا وجود نہ ہو (حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں) تو جنسی محبت کا، جس طرح ہم جنسی محبت کو سمجھتے اور جانتے ہیں، یعنی وہ محبت جو شدید خفقانِ قلب اور اضمحلالِ حواس کے ساتھ وارد ہوتی ہے، کوئی وجود ہی نہیں رہتا۔

موجودہ ناول کے تیسرے حصے میں میں نے سبینا کا قصہ سنایا ہے جہاں وہ اپنے سر پر ایک بولر ہیٹ (bowler hat) منڈھے نیم برہنہ کھڑی ہے اور اس کے برابر طوماش مکمل طور پر ملبوس کھڑا ہے، تو وہاں میں ایک چیز کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ جب وہ آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لے رہی تھی، درآنحالیکہ تحقیرِ ذات کے احساس نے اس کے شہوانی جذبات میں ہیجان برپا کیا ہوا تھا، تو ٹھیک وہ اس تصور میں محو تھی کہ طوماش نے اسے اس کے بولر ہیٹ سمیت ٹائلٹ پر بٹھا دیا ہے اور اسے رفع حاجت

۱۔ theodicy: یعنی اثباتِ عدلِ الٰہی۔

کرتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ اچانک اس کا دل بری طرح پھڑ پھڑانے لگتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ بے ہوش ہو جائے، وہ طوماش کو قالین پر کھینچ لاتی ہے اور جماع کی سرمستی سے لبریز چیخ بلند کرتی ہے۔

۵

وہ جو اس بات کے معتقد ہیں کہ دنیا کو خدا ہی نے تخلیق کیا ہے، اور وہ جن کے عقیدے کے مطابق یہ ازخود عالم وجود میں آئی ہے، تو ان دونوں کے درمیان جو بحث چلی آ رہی ہے اس کا تعلق ایسے مظاہر سے ہے جو ہماری عقل اور تجربے سے باہر ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ حقیقی تو وہ حدِ فاصل ہے جو ان لوگوں کو جو وجود کو باعتبار تحفہ (اس سے غرض نہیں کہ یہ کس نے دیا اور کس طرح دیا) شک وشبے کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان لوگوں سے بین طور پر الگ کرتی ہے جو وجود کو بلا چون وچرا، بلا کیف قبول کرتے ہیں۔

جملہ یورپی اعتقادات کے پیچھے، خواہ یہ مذہبی ہوں یا سیاسی، ہمیں ''آفرینش'' کے باب اول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس باب میں ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ دنیا بالکل ٹھیک ٹھاک تخلیق کی گئی تھی، کہ وجود انسانی خیر ہے، اور چنانچہ ہمیں افزائشِ نسل کا حق حاصل ہے۔ چلیے اس بنیادی عقیدے کو ''وجود سے قطعی اتفاق'' کا نام دیں۔

یہ بات کہ ابھی چند دن پہلے تک لفظ ''فضلہ''، ''ف...'' کی صورت چھپتا رہا ہے، تو یہ اخلاقی تاملات کے باعث نہیں تھا۔ ظاہر ہے، آپ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ فضلہ غیر اخلاقی چیز ہے! اس پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ سراسر مابعد الطبیعیاتی نوعیت کا ہے۔ یومیہ رفع حاجت نظریہ تخلیق کے ناقابلِ قبول ہونے کی یومیہ دلیل ہے۔ وہی ''یا یہ، یا وہ'' والا مسئلہ: فضلہ قابلِ قبول ہے (تو پھر اس صورت میں پاخانے کا دروازہ بھیڑنے کی چنداں ضرورت نہیں!) یا ہماری تخلیق کا جو طور ہے، وہ ناقابلِ قبول ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ''وجود سے قطعی اتفاق'' کا جو یہ جمالیاتی آدرش ہے، اس کا تعلق ایک ایسی دنیا سے ہے جہاں فضلے کا ردّ وانکار کیا جاتا ہے اور جہاں ہر کس وناکس اپنے طور طریق سے یہ ظاہر کرنے پر تلا بیٹھا ہے کہ فضلے کا دور دور کہیں وجود نہیں۔ اس جمالیاتی آدرش کا نام ''کچ'' (kitsch) ہے۔

''کچ'' جرمن زبان کا لفظ ہے جو جذباتیت زدہ انیسویں صدی کے نصف میں وجود میں آیا، اور جرمن سے دیگر مغربی زبانوں میں بھی در آیا۔ کثرتِ استعمال سے اس کے حقیقی، مابعد الطبیعیاتی معنی

جاتے رہے ہیں، اور اب وہ جن معنی میں مستعمل ہے، وہ یہ ہیں: ''کچ'' فضلے کا مطلق انکار ہے، حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں۔ کچ اپنی نظر کی حدود سے ہر وہ چیز خارج کر دیتا ہے جو وجودِ انسانی میں بنیادی طور پر نا قابلِ قبول ہے۔

۶

کمیونزم کے خلاف سبینا کی اولین، اندرونی بغاوت اخلاقی سے زیادہ جمالیاتی نوعیت کی تھی۔ اس کے تنفر کا باعث اشتراکیت کی کریہہ المنظری (دست بردِ زمانہ سے نڈھال، اجڑے، کہنہ قلعے جنھیں مویشی خانوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا) اتنی نہیں تھی، جتنی یہ بات کہ وہ خوبصورتی کا خول پہننے پر مصر تھی — بالفاظ دیگر اشتراکی کچ — اور اشتراکی کچ کا زرّیں ترین نمونہ وہ رسم ہے جسے یومِ مئی (May Day) کہا جاتا ہے۔

اس نے یومِ مئی کی پریڈ اس دور میں دیکھی تھی جب لوگ اس معاملے میں خاصے پُرجوش ہوا کرتے تھے، یا کم از کم اپنے پُرجوش ہونے کا سوانگ بھرنے کی حتی المقدور کوشش ضرور کیا کرتے تھے۔ سب ہی عورتیں زرق برق، سرخ، سفید، نیلے بلاؤز زیب تن کرتیں، اور اپنی بالکنیوں اور کھڑکیوں سے تماشا دیکھتے ہوئے عوام، پریڈ کرنے والوں کی مخصوص ترتیب اور آراستگی میں پنج زاویہ ستارے، قلب اور حروف تہجی کو بہ آسانی پہچان لیتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے براس بینڈ انفرادی ٹولیوں کے ساتھ ساتھ چلتے اور اپنی لے تال پر انھیں قدم ملا کر چلنے پر مجبور کرتے، اور جوں ہی ایک گروہ معائنے کی مچان (reviewing stand) پر پہنچتا، پژمردہ ترین چہرے بھی دم دماتی مسکراہٹ سے منور ہو جاتے، گویا اپنے مناسب طور پر شاداں و فرحاں ہونے کا ثبوت پیش کر رہے ہوں — یا یوں کہیے، مناسب طور پر ''متفق'' ہونے کا ثبوت۔ یہ محض اشتراکیت سے سیاسی موافقت کا اظہار نہیں، بلکہ بنفسہٖ وجود سے متفق ہونے کا اظہار تھا۔ تو یوں سمجھیے کہ یومِ مئی کی رسومات میں شامل ہونے کی تحریک وجود سے قطعی اتفاق کے گہرے سرچشمے سے نکلتی تھی۔ پریڈ کا بے لکھا اور بے لگایا نعرہ ''کمیونزم — زندہ باد!'' نہیں تھا، بلکہ ''حیات — زندہ باد!'' اشتراکی سیاست کی تمام تر قوت اور ساری استادی تو اس بات میں مضمر تھی کہ اس نے یہ نعرہ ہتھیا لیا تھا، کیونکہ ''حیات — زندہ باد!'' کے نعرے کی یہ تکرار ہی تھی جس کے

جذب وکشش سے متاثر ہو کر وہ لوگ بھی جو اشتراکیت کے مفروضوں سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے، اشتراکی پریڈ کی طرف کشاں کشاں چلے آتے تھے۔

۷

دس سال بعد (جب وہ امریکا میں سکونت پذیر تھی)، اس کے دوستوں کا ایک دوست جو ایک امریکی سینیٹر تھا، اپنی دیو پیکر کار میں سبینا کو لے کر سیر کے لیے نکلا۔ سینیٹر کے چار بچے کار کی پچھلی نشست پر مستقل دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ ایک اسٹیڈیم کے عین مقابل سینیٹر نے کار روک دی۔ اس اسٹیڈیم میں مصنوعی برف پر اسکیٹنگ کرنے کا ایک رِنک (rink) بھی تھا۔ بچے جست لگا کر کار سے باہر کود ے اور رِنک کے اطراف میں گھاس کے کشادہ قطعوں پر کنارے کنارے دوڑنے بھاگنے لگے۔ اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھے ہوئے اور خواب آلود نظروں سے ان چار کودتے پھاندتے پیکروں کو دیکھتے ہوئے، سینیٹر نے سبینا سے کہا، ''ذرا انھیں دیکھو!'' پھر ہاتھ اٹھا کر اس نے ایک خیالی ہالہ کھینچا، جس کی وسعت میں اسٹیڈیم، گھاس کے قطعے، بچے، سب ہی سما گئے، اور اضافہ کیا، ''صاحب، اب میں اس چیز کو مسرت کہتا ہوں۔''

اس کے الفاظ کے پیچھے بچوں کو قلانچیں بھرنے اور گھاس کو اگتے دیکھنے پر احساس مسرت کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ مثلاً ایک اشتراکی ملک سے آئے ہوئے مہاجر کی حالتِ زار کا مکمل احساس بھی؛ ایک ایسے اشتراکی ملک سے جہاں، سینیٹر صاحب کو پورا یقین تھا، نہ گھاس اگتی ہے، اور نہ بچے بلا روک ٹوک کلیلیں کرتے پھرتے ہیں۔

اس لمحے ایک پیکر سبینا کی نظروں کے آگے شرارے کی طرح کوند گیا۔ یہ پیکر سینیٹر کا تھا۔ وہ پراگ کے کسی چوک میں مُلکی معائنے کی مچان پر کھڑا ہوا تھا، اور اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو اشتراکی سربراہ اپنے معائنے کی مچان کی بلندی سے نیچے انھیں کی طرح متبسم پریڈ میں شامل عوام الناس کی طرف پھینکتے ہیں۔

۸

سینیٹر کو کیسے معلوم ہوا کہ بچوں کا ہونا مسرت کی دلیل ہے؟ کیا وہ ان کی روحوں میں نفوذ کر کے انھیں دیکھنے پر قادر تھا؟ ٹھیک بڑوں کی نظر سے اوجھل ہوتے ہی تین بچے مل کر چوتھے پر دھاوا بول دیتے اور اس کی ٹھکائی کر دیتے تو؟

سینیٹر کے پاس اپنے حق میں صرف ایک ہی دلیل تھی: اس کا اپنا احساس۔ جب دل کی زبان چل پڑے تو دماغ اس پر اعتراض کو نہایت ناشائستہ فعل گردانتا ہے۔ کچ کی اقلیم میں دل کی آمریت بے محابا حکمرانی کرتی ہے۔

کچ جس قسم کے احساس کو جنم دیتا ہے، وہ ایسا ہونا چاہیے جس میں عوام شریک ہو سکیں۔ چنانچہ کچ کا دارومدار کسی غیر معمولی صورت حال پر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کو تو ان بنیادی پیکروں اور علائم سے ابھرنا چاہیے جو عوام کی یادوں میں مرتسم ہوں: مثلاً ایک ناشکر گذار بیٹی، ایسا باپ جس سے غفلت برتی جا رہی ہو، گھاس کے قطعوں پر دوڑتے بھاگتے بچے، مادرِ وطن جس کے ساتھ دغا کی گئی ہو، پہلی محبت۔

کچ دو آنسوؤں کو آنکھوں سے یکے بعد دیگرے رواں کرتا ہے۔ پہلا آنسو کہتا ہے: بچوں کو گھاس پر کودتا پھاندتا دیکھنا کس قدر بھلا ہے!

دوسرا آنسو کہتا ہے: بچوں کو گھاس پر کودتا پھاندتا دیکھ کر، جملہ انسانیت کے ساتھ، متاثر ہونا کتنا بھلا ہے!

یہ دوسرا آنسو ہی ہے جو کچ کو صحیح معنوں میں کچ بناتا ہے۔
کرۂ ارض پر اخوتِ آدم صرف کچ ہی کی بنیاد پر ممکن ہے۔

۹

اور اس بات کو سیاست دانوں سے زیادہ کوئی اور نہیں جانتا۔ دور سے کیمرے کی جھلک نظر آئی نہیں کہ فوراً قلانچ بھر کر قریب ترین بچے کو لپک کر گود میں اٹھالیا اور گال پر بوسہ جڑ دیا۔ تمام سیاست دانوں، سیاسی پارٹیوں اور تحریکوں کا جمالیاتی آدرش کچ ہی ہے۔

ہم میں سے وہ جو ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جس میں مختلف النوع سیاسی رجحانات کے لیے

شانہ بہ شانہ رہنے کی گنجائش موجود ہے، اور جہاں ہم سر اثرات ایک دوسرے کو قلم زد کرتے ہیں یا کم از کم ان کے دباؤ کو محدود — کچ کے احتساب سے کم و بیش بچ سکتے ہیں: فرد اپنی انفرادیت کا تحفظ کر سکتا ہے، فنکار غیر معمولی چیز تخلیق کر سکتا ہے۔ تاہم جب بھی کوئی مخصوص سیاسی تحریک طاقت پر قابض ہو جاتی ہے تو پھر ہم اپنے کو آمرانہ کچ کی مملکت میں پاتے ہیں۔

''آمرانہ'' سے میری مراد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کچ سے مزاحم ہو، اسے مدتِ عمر بے وطن کر دیا جائے۔ نہ صرف یہی بلکہ انفرادیت کے ہر مظاہرے کو بھی (کیونکہ جماعت سے انحراف، بشاش اور متبسم اخوت کی نظر میں، نفاق کے مترادف ہے) اور ہر شک شبہے کو (کیونکہ وہ شخص جو اجزا پر شبہہ کرنے لگتا ہے، انجام کار خود زندگی پر بھی شبہہ کرنے لگتا ہے)، اور ہر طنز کو (کیونکہ کچ کی سلطنت میں ہر شے کو بکمال سنجیدگی برتنا از بس ضروری ہے)، اور اس ماں کو جو گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہو، اور یا اس آدمی کو جو عورتوں کے مقابلے میں اپنی جنس کو ترجیح دیتا ہو اور یوں اپنے فعل سے اس امرِ مقدس کو للکارتا ہو: ''بارآور ہو اور افزائش نسل کرو!''

اس روشنی میں ہم گولاگوں (gulags) کو تعفن کے گڑھوں سے تعبیر کر سکتے ہیں، جنھیں آمرانہ کچ اپنی غلاظت سے پیچھا چھڑانے کی خاطر استعمال کرتا ہے۔

۱۰

دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد آنے والی دہائی اسٹالنی دہشت کا مکروہ ترین دور تھی۔ یہ وہی دور تھا جس میں تیریزا (Tereza) کے باپ کو بہت معمولی الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور دہ سالہ تیریزا کو فلیٹ سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ اور یہ وہ دور بھی تھا جس میں بیس سالہ سبینا فنونِ لطیفہ کی اکیڈمی میں زیرِ تعلیم تھی۔ یہاں اس کے مارکسزم کے استاد نے سوشلسٹ آرٹ کے مندرجہ ذیل نظریے کی تشریح کی: سوویت معاشرے نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بنیادی تصادم اب خیر و شر کے درمیان نہیں رہا بلکہ خیر و بہتر کے درمیان۔ چنانچہ فضلے کا وجود (یعنی ہر اُس چیز کا وجود جو اصلاً ناقابلِ قبول ہو) صرف دوسری طرف (مثلاً امریکا میں) ہی ممکن ہے، اور وہیں، یعنی باہر ہی، سے ایک مکمل اجنبی شے (مثلاً ایک جاسوس) ہی کی طرح ''خیر و بہتر'' کی دنیا میں جاگزیں ہو سکتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس اذیت ناک دور میں سوویت فلموں کی تمام اشتراکی ملکوں میں سخت ریل پیل تھی، اور یہ فلمیں بڑی ناقابلِ یقین معصومیت اور عفت سے لبریز ہوا کرتی تھی۔ دو روسیوں کے درمیان بڑے سے بڑا تصادم جو ہو سکتا تھا، اس کی نوعیت اس غلط فہمی سے زیادہ نہیں تھی جو دو محبت کرنے والوں کے درمیان پیدا ہو جائے۔ مثلاً عاشق کے خیال میں محبوبہ کو اس سے محبت نہیں رہی تھی، محبوبہ کے خیال میں عاشق کو اس سے عشق نہیں رہا تھا۔ آخری منظر میں دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں آ گرتے، اور فرطِ مسرت سے ان کے آنسو جاری ہو جاتے۔

ان فلموں کی موجودہ رواجی تفسیر یہ ہے، یہ اشتراکی آئیڈیل پیش کرتی تھیں جبکہ اشتراکی حقیقت کہیں بدتر تھی۔

سبینا ہمیشہ ہی اس تفسیر کے خلاف ردِعمل ظاہر کرتی۔ جوں ہی اس کے تصور میں آتا کہ سوویت کچ کی کائنات بس اب حقیقت میں تبدیل ہوا چاہتی ہے، اس کی پشت پر ایک برفانی لہر دوڑ جاتی اور اس پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ ایک حقیقی اشتراکی حکومت میں زندگی گزارنے میں اسے کوئی تامل نہیں تھا، بلکہ وہ تو اس کو زیادہ قابلِ ترجیح سمجھتی تھی۔ اس کے لیے اسے سب کچھ قبول تھا، حتیٰ کہ گوشت خریدنے کے لیے گھنٹوں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہنا، یا کوئی اور اذیت جو اسے پہنچے۔ ایک حقیقی اشتراکی ملک میں زندگی پھر بھی بسر کیے جانے کے قابل تھی، لیکن ایسی اشتراکی کائنات میں جہاں اشتراکیت کا آدرش حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہو، یعنی دانت نکال کر ہنستے ہوئے احمقوں کی کائنات، تو یہاں اس کے لیے کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا تھا۔ یہاں تو ہفتے کے اندر اندر ہی اس کی موت واقع ہو جاتی۔

سوویت کچ کے تصور سے جو احساس سبینا میں اٹھتا، وہ مجھے تیریزا کی اس دہشت سے کافی ملتا جلتا نظر آتا ہے جو اسے یہ خواب دیکھ کر محسوس ہوئی: اسے برہنہ عورتوں کی ایک ٹولی کے ساتھ سوئمنگ پول کے چاروں طرف مارچ کرایا جا رہا ہے؛ اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ ان عورتوں کے ساتھ مل کر ہنسی خوشی کے گیت گائے، جبکہ پول میں سطحِ آب سے ذرا نیچے لاشیں ہی لاشیں تیرتی پھر رہی ہیں۔ تیریزا ان عورتوں سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکتی، اور اگر پوچھ بھی لے تو جواب میں گائے جانے والے گیت کا صرف دوسرا بند ہی اسے سنائی دے گا۔ اور تو اور، وہ تو ان عورتوں کی طرف دیکھ کر خفیف سی پلک بھی نہیں مار سکتی، کیونکہ اس صورت میں وہ عورتیں فوراً اس آدمی سے اس کی نشاندہی کر دیں گی جو پول کے اوپر ایک

چنگیری میں کھڑا ہوا ہے۔ وہ فوراً تیریزا کو گولی مار دے گا۔

تیریزا کا خواب کِچ کے طریقِ عمل کو بے کم و کاست ظاہر کرتا ہے: کِچ ایسا فولڈنگ پردہ ہے جسے موت کی پردہ پوشی کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔

۱۱

کِچ کی آمرانہ کائنات میں سارے جواب پیشگی دے دیے جاتے ہیں اور سوالوں کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً، آمرانہ کِچ کا سچا حریف وہ شخص ہے جو سوال کرتا ہے۔ سوال چاقو کی طرح ہے جو اسٹیج کے پردے کو چاک کر کے پیچھے جو کچھ ہے اس کا منظر دکھائے۔ ٹھیک ٹھیک انھیں لفظوں میں سبینا نے تیریزا سے اپنی پینٹنگز کے معنی کی تشریح کی تھی: سطح پر ایک قابلِ فہم دروغ اور زیرِ سطح جھانکتا ہوا ناقابلِ فہم سچ۔

لیکن وہ لوگ جو آمرانہ نظامِ حکومت کے خلاف جہاد کرتے ہیں، شک وشبہے یا علائم سے کام نہیں لے سکتے۔ عوام الناس کو اپنا موقف سمجھانے اور اجتماع کو آبدیدہ کرنے کے لیے انھیں بھی مسلمات، تیقنات، اور عام سچائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک بار سبینا کی تصویروں کی نمائش ہوئی تھی۔ اس کا اہتمام جرمنی کی ایک سیاسی تنظیم نے کیا تھا۔ جب اس نے اپنی تصویروں کا کیٹلاگ اٹھا کر دیکھا تو اس میں نظر آنے والی سب سے پہلی تصویر خود اس کی اپنی ہی تھی۔ اس کے عکس کے اوپر خاردار تاروں کی ایک ڈرائنگ ثبت تھی۔ کیٹلاگ کے اندر اسے اپنے کوائف نظر آئے جنھیں پڑھو تو معلوم ہو کہ وہ تو اچھی خاصی بھگت ہے، یا بھگت نہیں تو کم از کم شہید تو یقیناً۔ اس نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائی ہیں، ناانصافی کے خلاف برسرِ پیکار رہی ہے، اپنے خون رِستے وطنِ عزیز سے نکل جانے پر مجبور کر دی گئی ہے۔ مگر ان تمام آزمائشوں کے باوجود اس کا جہاد جاری ہے۔ آخری جملہ تھا، ''اس کی پینٹنگز حصولِ مسرت کی جدوجہد ہیں!''

سبینا نے احتجاج کیا، لیکن وہ اسے نہیں سمجھے۔

''تو کیا تمھارے خیال میں اشتراکیت کی عملداری میں جدید آرٹ پر ظلم وستم نہیں ہو رہا؟''

''میرا اصلی دشمن کِچ ہے، اشتراکیت نہیں،'' اس نے چراغ پا ہو کر جواب دیا۔

اس کے بعد سے سبینا نے اپنے کوائف میں جان بوجھ کر نہایت گمراہ کن جزئیات ڈالنی شروع کر دیں، تا آنکہ جب وہ امریکا پہنچی تو اصلاً اپنے چیک شہری ہونے کی حقیقت پر بھی بخوبی پردہ ڈال چکی تھی۔ یہ محض اس کچ سے، جس میں لوگ اس کی زندگی کو تبدیل کرنے پر تلے بیٹھے تھے، مفر کی ایک بے جگرانہ کوشش تھی۔

۱۲

وہ اپنے ایزل کے سامنے کھڑی تھی جس پر ایک نیم مکمل کینوس تھا۔ اور وہ پیر کہن سالہ، جو عین اس کے پیچھے آرام کرسی میں دھنسے بیٹھے تھے، اس کے موقلم کی ہر جنبش کا بڑی گہری نظروں سے مطالعہ کر رہے تھے۔

''اب گھر چلنا چاہیے،'' بڑے میاں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بالآخر کہا۔

سبینا نے رنگوں کی پلیٹ نیچے رکھ دی اور ہاتھ صاف کرنے غسل خانے گئی۔ بڑے میاں نے کسی نہ کسی طرح خود کو آرام کرسی کے غار سے نکالا اور اپنی چھڑی کو اٹھانے کے لیے، جو میز سے ٹکی کھڑی تھی، ہاتھ بڑھایا۔ اسٹوڈیو کا دروازہ اس چھوٹی روش پر کھلتا تھا جس سے آپ براہ راست لان تک جا سکتے ہیں۔ جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ تاریکی دم بدم بڑھ رہی تھی۔ پچاس قدم کی دوری پر clapboard کا سفید گھر تھا۔ زیریں منزل کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ جاں بلب دن کی تاریکی میں ضوفشاں کھڑکیوں کے منظر نے سبینا کو بہت متاثر کیا۔

اپنی ساری زندگی میں سبینا کچ کو اعلانیہ اپنا دشمن قرار دیتی رہی تھی۔ بایں ہمہ، کیا وہ اسے ہر جگہ اپنے ہمراہ لیے لیے نہیں پھرتی رہی تھی؟ اس کا اپنا مخصوص کچ گھر کے تصور سے عبارت تھا۔ ایسا گھر جہاں مکمل امن وامان ہو، خاموشی ہو اور ہم آہنگی ہو، جس میں ایک شفیق ماں اور ایک عاقل باپ راج کرتے ہوں۔ یہ وہ پیکر تھا جو اس کے والدین کے انتقال کے بعد ہی آہستہ آہستہ اس کے تصور میں متشکل ہوا تھا۔ اس کی حقیقی زندگی اس شیریں خواب سے جس قدر کم مماثل رہی، اتنا ہی زیادہ اس نے خود کو اس کے سحر کے زیر اثر پایا، اور جب کسی جذباتی فلم میں ناشکری بیٹی اپنے غفلت برتتے ہوئے باپ سے ٹھیک اسی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئی جس سے اِس وقت اس پُرمسرت گھر کی دونوں منور کھڑکیاں

جاں بلب دن کی تاریکی سے ہورہی تھیں، تو ایک سے زائد بار سبینا کے بے اختیارانہ آنسو نکل آئے۔

ان بڑے میاں سے اس کی ملاقات نیویارک میں ہوئی تھی ۔ وہ متمول آدمی تھا اور پینٹنگز کا دلدادہ۔ شہر سے باہر اس کا ایک کنٹری ہاؤس تھا۔ جس میں تنہا وہ اور اس کی بیوی، جو خود بھی کھوسٹ ہوتی جارہی تھی، رہتے تھے۔ اس گھر کے عین مقابل اس کی اراضی پر ہی ایک اصطبل تھا۔ بڑے میاں نے اس کی مناسب مرمت اور تبدیلی کروا کر سبینا کے لیے ایک اسٹوڈیو بنوا دیا تھا۔ یہاں وہ دنوں بیٹھا بیٹھا سبینا کے موقلم کی جنبش کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ تینوں شام کے کھانے میں مصروف تھے۔ بڑی بی سبینا کو "میری بیٹی" کہہ کر پکارتی لیکن سارے قرائن اس کے بالکل الٹ حقیقت کے غماز تھے: ماں تو دراصل سبینا تھی اور یہ دونوں اس کے بچے تھے، جو طرح طرح سے اس سے اپنی ناز برداری کرواتے، اس کی پرستش کرتے، اور اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔

تو کیا اب کہیں جا کر سبینا نے، جو خود بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی تھی، آخرالامر اپنے ماں باپ کو پا لیا تھا جو بچپن میں اس سے چھین لیے گئے تھے؟ تو کیا اب اُسے، انجام کار، وہ بچے مل گئے تھے جنھیں اس کی کوکھ نے جنم نہیں دیا تھا؟

اسے خوب معلوم تھا کہ یہ سب ایک فریبِ نظر ہے۔ اس معمر جوڑے کے ساتھ اس کی زندگی کی حیثیت ایک مختصر وقفے سے زیادہ نہیں۔ بوڑھا سخت بیمار تھا، اس کے مرتے ہی بڑی بی اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا جارہے گی۔ دغا اور بے وفائی کی جس راہ پر سبینا گامزن ہے وہ کہیں اور پھر سے جاری ہو جائے گی، اور اس کے وجود کی گہرائیوں سے دو منور کھڑکیوں اور ان کے عقب میں رہنے والے مسرور کنبے کی حسرت پر ایک احمقانہ، رقت آمیز نغمہ جب تب اٹھ کر وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت کو اپنی راہ پالے گا۔

سبینا نغمے سے متاثر ضرور ہوئی، لیکن اس نے اپنے جذبات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ نغمہ ایک من موہنا کذب ہے۔ ٹھیک جس لمحے ہم کچ کو دروغ کی حیثیت سے پہچان لیتے ہیں، اس کے سیاق وسباق بدل جاتے ہیں۔ اب وہ غیر کچ (non-kitsch) بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کی ساری آمرانہ طاقت جاتی رہتی ہے، اور یہ اتنا ہی اثر انگیز اور دل موہ لینے والا بن جاتا ہے جتنی کوئی اور انسانی کمزوری۔ ہم میں کوئی بھی اتنا مردِ کامل اور فوق البشر نہیں جو خود کو کچ سے بالکل ہی بچالے

جائے۔ ہم اس سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کریں، آخرالامر، کچ انسانی صورتِ حال کا جزولاینفک ہے۔

۱۳

کچ کا سرچشمہ ''وجود سے قطعی اتفاق'' میں پایا جاتا ہے۔

لیکن اس وجود کی بنیاد کیا ہے؟ خدا؟ عالمِ انسانیت؟ جدوجہد؟ محبت؟ آدمی؟ عورت؟

چونکہ آرا مختلف ہوتی ہیں، اس لیے کچ کی اقسام بھی مختلف ہیں۔ مثلاً کیتھولک کچ، پروٹسٹنٹ کچ، یہودی، کمیونسٹ، فاشسٹ کچ، جمہوریت پسند کچ، فیمینسٹ (feminist) کچ، یورپی، امریکی، قومی اور بین الاقوامی کچ۔

انقلابِ فرانس سے نصف یورپ کو ''دایاں'' اور بقیہ نصف کو ''بایاں'' کہہ کر پکارا جاتا رہا ہے۔ لیکن دونوں میں سے ایک کی تعریف ان نظریاتی اصولوں کی روشنی میں تقریباً ناممکن ہے جن کا وہ پرچاری رہا ہے۔ تعجب کیسا! سیاسی تحریکوں کی بنیاد عقلی رویوں پر کب رہی ہے۔ بلکہ یہ تو توہمات، علائم، الفاظ، اور آرکی ٹائپس کے امتزاج ہی سے یہ یاوہ سیاسی کچ تخلیق کرتی ہیں۔

''گرانڈ مارچ'' کی فینٹسی، جس سے فرانز (Franz) اس درجہ مسحور ہوا تھا، دراصل وہ سیاسی کچ ہے جو جملہ وقتوں کے بائیں بازو والوں اور رجحانات کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ گرانڈ مارچ، اخوت، برابری، انصاف اور مسرت کی راہ پر جاری شان دار مارچ ہے ـــــ مسلسل رواں، رکاوٹوں کے باوجود، کہ رکاوٹیں نہ ہوں تو گرانڈ مارچ، گرانڈ مارچ کیسے رہے گی!

پرولتاریوں کی ڈکٹیٹرشپ ہو یا جمہوریت؟ کنزیومر (consumer) معاشرے کا رد ہو یا پیداوار بڑھانے کا مطالبہ؟ گیلوٹین یا سزائے موت کا سرے سے خاتمہ؟ ان سب کا اصل نکتے سے کوئی تعلق نہیں۔ بائیں بازو والے کو جو چیز بائیں بازو والا بناتی ہے وہ کوئی نظریہ نہیں، بلکہ اس کی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے وہ ہر نظریے کو اس کچ کے ساتھ تامیاتی طور پر منتھی کر دیتا ہے جسے ''گرانڈ مارچ'' کہا جاتا ہے۔

۱۴

ظاہر ہے کہ اب فرانز کو کچ کا پجاری تو نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی زندگی میں گرانڈ مارچ کی فینٹسی کی کم وبیش وہی اہمیت تھی جو دو منور کھڑکیوں سے متعلق رقت آمیز نغمے کی سبینا کی زندگی میں تھی۔ فرانز نے کس سیاسی جماعت کے حق میں اپنا ووٹ ڈالا تھا؟ آپ کو افسوس ہوگا، لیکن اس نے سرے سے ووٹ ڈالا ہی نہیں تھا۔ انتخاب والے دن تو اس نے پہاڑوں میں سیر وتفریح کو ترجیح دی تھی۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ گرانڈ مارچ سے مزید متاثر ہونے کی صلاحیت اس میں مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ یہ خواب کہ ہم ایک ایسے انبوہ کا حصہ ہیں جو جشن مناتا ہوا ٹھیک کئی صدیوں سے ہوکر گزر رہا ہے، ہمیشہ ہی بڑا دل پذیر ہوتا ہے، پھر فرانز تو کبھی اس خواب کو نہیں بھولا تھا۔

ایک دن چند دوستوں نے اسے پیرس سے فون کیا۔ وہ کمبوڈیا کے حق میں وہاں جا کر باقاعدہ احتجاجی مارچ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ انھوں نے فرانز کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی۔

کمبوڈیا حال ہی میں امریکی بمباری، خانہ جنگی، مقامی اشتراکیوں کی مجنونانہ خونریزی — جس نے اس چھوٹی سی قوم کی ایک بٹا پانچ چھٹائی کر کے رکھ دی تھی — اور، آخرکار ہمسایہ ویت نام کے جنگی قبضے سے، جو اس وقت محض روس کے حلقہ بگوشوں میں سے تھا، گزر چکا تھا۔ دوسری طرف قحط نے اس کی کمر توڑ رکھی تھی۔ لوگ ادویہ اور طبی امداد کی قلت کے باعث دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ ایک بین الاقوامی طبی کمیٹی ملک میں داخل ہونے کی اجازت مانگ رہی تھی، لیکن ویت نامی مسلسل انکار کیے جا رہے تھے۔ تو منصوبہ یہ بنا کہ مغرب کے چیدہ چیدہ دانشوروں کا ایک گروہ مارچ کرتا ہوا کمبوڈیا کی سرحد پر پہنچے اور دنیا کی نظروں کے سامنے اپنے عظیم الشان تماشے کے مظاہرے سے قابض ملک کو ڈاکٹروں کے داخلے پر مجبور کر دے۔

جس دوست نے فرانز سے بات کی، وہی تھا جس کے ساتھ فرانز ایک بار پہلے پیرس کی شاہراہوں پر ایسی ہی مظاہراتی مارچ کر چکا تھا۔ اول اول تو اس دعوت پر فرانز خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ لیکن پھر اس کی نظریں اپنی شاگرد داشتہ پر جا پڑیں جو کمرے میں آرام کرسی میں دھنسی بیٹھی تھی۔ وہ سر اوپر کیے فرانز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چشمے کے محدب عدسوں کے عقب میں اس کی آنکھیں بڑی بڑی لگ رہی تھیں۔ فرانز کو محسوس ہوا کہ وہ آنکھیں اس سے نہ جانے کی التجا کر رہی ہیں۔ چنانچہ اس نے

متاسفانہ مارچ میں شرکت سے معذرت کر لی۔

لیکن فون رکھتے ہی وہ اپنے فیصلے پر پچھتانے لگا۔ یہ درست تھا کہ اس طرح وہ اپنی دنیوی داشتہ کی خبر گیری کر رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے غیر ارضی عشق سے چشم پوشی بھی۔ کیا نہیں؟ کیا کمبوڈیا ٹھیک سبینا کے ملک کی طرح نہ تھا؟ ایسا ملک جس پر اس کے ہمسایہ ملک کی اشتراکی فوج نے قبضہ کر لیا تھا! ایسا ملک جس نے روس کے مکّے کی ضرب سہی تھی! اچانک فرانز کو محسوس ہوا جیسے اُس کے نیم فراموش کردہ دوست نے سبینا ہی کے خفیہ اشارے پر اس سے رابطہ قائم کیا ہو۔

سماوی اجسام سب کچھ دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مارچ پر چلا جاتا تو سبینا سحر زدہ نیچے اس کی طرف دیکھتی؛ اسے معلوم ہوتا کہ وہ اس کا وفادار رہا ہے۔

''اگر میں مارچ پر جاؤں تو تم بہت زیادہ برا تو نہیں مانو گی؟'' اس نے چشمے والی لڑکی سے پوچھا؛ اس لڑکی سے جو ہر ایسے دن کو جو فرانز سے دور گزرا ہو سراسر زیاں تصور کرتی تھی، تاہم اس کی کسی بھی خواہش کو پورا نہ کرنے پر قادر بھی نہ تھی۔

چند دنوں بعد وہ ایک گرانڈیل جیٹ طیارے میں بیٹھا ہوا تھا، جو کوئی بیس ڈاکٹروں، لگ بھگ پچاس دانشوروں (جن میں پروفیسر، ادبا، سفارتی ارکان، گلوکار، اداکار، اور صدر ہائے بلدیہ شامل تھے)، علاوہ ازیں کوئی چار سو رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کو لیے پیرس سے پرواز کر رہا تھا۔

۱۵

طیارہ بینکاک اترا۔ چار سو ستر ڈاکٹر، دانشور اور رپورٹر ایک بین الاقوامی ہوٹل کے بال روم میں پہنچے جہاں پہلے ہی سے مزید ڈاکٹروں، اداکاروں، گلوکاروں، اور لسانیات کے پروفیسروں کی ایک بھاری تعداد مع چند سو صحافیوں کے، جو نوٹ بکوں، ٹیپ ریکارڈروں اور وڈیو واسٹل کیمروں سے لیس تھے، موجود تھی۔ پوڈیم پر کوئی بیس بائیس امریکیوں کا ایک گروہ ایک لمبی سی میز کے گرد بیٹھا کارروائی کی صدارت کر رہا تھا۔

فرانسیسی دانشوروں نے، جن کی معیت میں فرانز ہال روم میں داخل ہوا تھا، اسے اپنی ہتک تصور کیا۔ کمبوڈیا کے لیے مارچ اصلاً انہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ اور ستم یہ کہ یہاں ان امریکیوں نے

حسبِ معمول نہایت دیدہ دلیری سے نہ صرف یہ کہ ساری کارروائی پر قبضہ کرلیا تھا، بلکہ انگریزی میں قبضہ کرلیا تھا، بغیر اتنا خیال کیے کہ اب کوئی فرانسیسی یا ڈنمارک کا باشندہ ان کی بولی سمجھنے سے رہا۔ چونکہ ڈنمارک کے باشندے زمانہ ہوا بھول چکے تھے کہ کبھی وہ بھی باقاعدہ ایک قوم ہوا کرتے تھے، اس حق تلفی کے خلاف احتجاج کے لیے بس اب فرانسیسی ہی باقی رہ گئے تھے۔ ان کے اصولوں کی بلندی اور عظمت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے احتجاج کے لیے بھی انگریزی بولنے سے انکار کردیا۔ فلانچ بھر کے پوڈیم پر در آئے اور امریکیوں کو اپنا مافی الضمیر اپنی مادری زبان میں بیان کرنے لگے۔ امریکیوں نے، جن کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا، دوستانہ، اعترافی تبسم سے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔ ناچار فرانسیسیوں کو اپنے اعتراضات انگریزی میں بیان کرنے پڑے۔ ''اس میٹنگ کی کارروائی انگریزی میں کیوں ہورہی ہے جبکہ اس میں فرانسیسی موجود ہیں؟''

اس عجیب اعتراض پر متحیر ہونے کے باوجود، امریکی، جو ہنوز متبسم تھے، میٹنگ کو دونوں زبانوں میں چلانے پر رضا مند ہوگئے۔ لیکن میٹنگ کو دوبارہ جاری کرنے سے پہلے ایک موزوں ترجمان (interpreter) کی ضرورت آپڑی۔ اس کے بعد، ہر جملہ پہلے انگریزی میں اور پھر فرانسیسی میں گونجا، جس کے باعث بحث کے لیے دگنا وقت درکار ہوا، بلکہ دگنے سے بھی زیادہ، وہ یوں کہ فرانسیسی تھوڑی بہت انگریزی بہرحال جانتے تھے چنانچہ ترجمان کا مسلسل قطع کلام کرکے اس کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے، اور ہر لفظ کی صحت اور موزونیت پر بحث الگ۔

اس جلسے کا نقطۂ عروج اس وقت آیا جب ایک امریکی اداکارہ تقریر کرنے کھڑی ہوئی۔ خاص محترمہ کی خاطر مزید فوٹوگرافروں اور کیمرامینوں کا ایک جمِ غفیر آڈیٹوریم میں در آیا۔ اس کے ہر لفظ کے ہر رکن کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کیمرے کی کلک سنائی دی۔ اداکارہ نے اذیت میں مبتلا بچوں کی بات کی، اشتراکی ڈکٹیٹرشپ کے وحشیانہ سلوک کا ذکر اٹھایا، تحفظ کے انسانی حق کا رونا، مہذب معاشرے کی روایتی اقدار کو جس موجودہ خطرے کا سامنا تھا، اس خبردار کیا، فرد کے غیر منفک حقِ آزادی کا پرچار کیا، اور صدر کارٹر کا ذکرِ خیر بھی جو کمبوڈیا میں پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے بے حد مغموم تھے۔ تقریر کے اختتام تک آتے آتے اس کی آنکھوں سے باقاعدہ گنگا جمنا رواں تھی۔

اس تقریر کے ختم ہوتے ہی سرخ مونچھوں والے ایک نوجوان فرانسیسی ڈاکٹر نے یکایک جست

بھری اور نعرہ لگایا: ''ہم یہاں مرتے ہوؤں کے علاج معالجے کے لیے آئے ہیں، صدر کارٹر پر تحسین کے ڈونگرے برسانے کے لیے نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس تقریب کو امریکی پروپیگنڈے کے سرکس میں بدل جانے سے روکیں۔ ہم یہاں اشتراکیت کے خلاف احتجاج کرنے نہیں آئے ہیں! ہم زندگیاں بچانے آئے ہیں!''

اس بات پر فوراً کئی فرانسیسیوں نے پرزور صاد کیا۔ ترجمان بے چاری مارے خوف کے سہم گئی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے جذبات کا ترجمہ کرے۔ چنانچہ ان بیس کے لگ بھگ امریکیوں نے، جو ہنوز پوڈیم پر براجمان تھے، ایک بار پھر اپنی مہربان، خیر خواہ، متبسم نظریں ادھر ادھر دوڑائیں، اور ان میں سے چند ایک نے تو تائید میں سر بھی ہلا دیا۔ ایک نے تو باقاعدہ ہوا میں اپنا مکا بھی لہرایا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اجتماعی سرخوشی (euphoria) کے عالم میں یورپی لوگ بالعموم اپنی مٹھیاں ہوا میں لہرانے کے عادی ہوتے ہیں۔

۱۶

اب صاحب، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بائیں بازو کے دانشور (وہ لال مونچھوں والا ڈاکٹر یقیناً بائیں بازو کا ہی تھا) ایک اشتراکی ملک کے مفاد کے خلاف احتجاجی مارچ کرنے پر رضامند ہو جائیں گے جب کہ خود اشتراکیت ہمیشہ ہی بائیں بازو والوں کا حلقۂ اثر و رسوخ سمجھی جاتی رہی ہے؟

جب ایک ملک، جسے سوویت یونین کہا جاتا ہے، کے جرائم رسوائی کی حد کو جا پہنچیں، تو ایک بائیں بازو والے کے لیے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں: یا تو اپنی سابقہ زندگی پر نفریں بھیج کر، مارچ ختم کر کے گھر بیٹھ جائے، یا (کم و بیش بزدلانہ طور پر) سوویت یونین کو گرانڈ مارچ کی راہ کی رکاوٹ سے تعبیر کر کے، مارچ جاری رکھے۔

کیا میں پہلے ہی یہ نہیں کہہ چکا ہوں کہ جو چیز بائیں بازو والے کو بایاں بازو والا بناتی ہے وہ گرانڈ مارچ کا کچ ہی ہے؟ کچ کا تعین اور تشخص کسی سیاسی حکمتِ عملی سے نہیں بلکہ علامتی پیکروں، استعاروں اور الفاظ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ عادت کو توڑنا اور ایک اشتراکی ملک کے مفاد کے خلاف مارچ کرنا عین ممکن ہے، لیکن ایک لفظ کو دوسرے سے بدل لینا، یہ بہرحال ممکن نہیں۔ ویت نامی فوج کو اپنا مکا

دکھا کر ڈرانا دھمکانا ممکن ہے، ''اشتراکیت مردہ باد!'' کا نعرہ لگانا ممکن نہیں۔ ''اشتراکیت مردہ باد!'' وہ نعرہ ہے جو صرف محض گرانڈ مارچ کے مخالفین کی جاگیر ہے۔ اور ہر وہ شخص جسے خفت کا خوف دامن گیر ہو، اس کے لیے ازبس ضروری ہے کہ اپنے ذاتی کچ کی صحت وصلابت کا وفادار رہے۔

میں نے جو یہاں ان باتوں کا ذکر کیا ہے تو اس کی ساری وجہ اس غلط فہمی کی تشریح ہے جو فرانسیسی ڈاکٹر اور امریکی اداکارہ کے درمیان پیدا ہوئی؛ وہ امریکی اداکارہ جو حد درجہ خود بیں ہونے کے باوجود اپنے کورشک اور زن بیزاری کا ہدف سمجھتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فرانسیسی ڈاکٹر نے ایک نہایت لطیف جمالیاتی حس کا مظاہرہ کیا تھا، کیونکہ ''صدر کارٹر''، ''ہماری روایتی اقدار''، ''اشتراکیت کی سفاکی'' اور اس قسم کے سارے جملوں کا تعلق براہ راست امریکی کچ سے ہے، اور گرانڈ مارچ کی کچ سے دور کا بھی نہیں۔

۱۷

اگلی صبح وہ سب بس پر سوار ہوئے اور تھائی لینڈ سے ہوتے ہوئے کمبوڈیا کی سرحد کو چل دیے۔ شام پڑنے پر انھوں نے بس ایک چھوٹے سے گاؤں میں رکوائی۔ یہاں پر انھوں نے پابانسوں پر کھڑے ہوئے کئی گھر کرائے پر لے رکھے تھے۔ دریا کی باقاعدہ طغیانی نے دیہاتیوں کو اپنے گھر سطح زمین سے اوپر بنانے پر مجبور کر دیا تھا، جبکہ نیچے ان کے سؤر ٹھنسے ٹھنسائے، سمٹے سمٹائے پڑے رہتے۔ فرانز جس کمرے میں سویا وہاں اس کے علاوہ چار پروفیسر لوگ بھی تھے۔ دور سے سؤروں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں، اور بالکل قریب سے ایک معروف ریاضی دان کے خراٹوں کی۔

صبح ہوتے ہی وہ پھر بسوں میں سوار ہو گئے۔ سرحد سے کوئی میل بھر ادھر ایک مقام پر ہر قسم کی سواریوں کے استعمال پر پابندی تھی۔ جس مقام پر سرحد کو عبور کیا جا سکتا تھا، وہاں تک محض ایک تنگ سے راستے کے ذریعے ہی جایا جا سکتا تھا، جس پر سخت پہرہ تھا۔ بسیں رک گئیں۔ جب فرانسیسی دستہ نیچے اترا تو پتا چلا کہ امریکی یہاں بھی ان سے بازی لے گئے ہیں اور پریڈ کا طلیعہ بنے کھڑے ہیں۔ فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔ ترجمان کو دوبارہ بلوایا گیا اور باقاعدہ بحثا بحثی ہونے لگی۔ بڑی ردوقدح کے بعد کہیں جا کر حاضرین اس بات پر متفق ہو گئے کہ پریڈ کی قیادت ایک امریکی، ایک فرانسیسی، اور ترجمان کریں گے، اس کے بعد ڈاکٹروں کا نمبر آئے گا، اور اس کے بعد ہی بقیہ جمگھٹے کا۔ امریکی اداکارہ کے حصے میں

دنبالے کی قیادت آئی۔

سڑک تنگ تھی اور اس کے دورویہ بارود کی سرنگیں بچھی تھیں۔ کسی روک، مثلاً خاردار تاروں سے لپٹے ہوئے سیمنٹ کے دو ایک بلاک، کے آجانے سے یہ اور بھی تنگ ہو جاتی اور اس پر صرف ایک قطار بنا کر ہی چلا جا سکتا تھا۔

فرانز سے کوئی پندرہ فٹ آگے ایک مشہور جرمن شاعر اور پاپ سنگر تھا جو اب تک نو سو تیس گانے امن و آشتی کے حق میں اور جنگ کے خلاف لکھ چکا تھا۔ وہ ہاتھ میں جھنڈا اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ جھنڈے کی براق سفیدی نے شاعر کی سیاہ داڑھی کو ایک انفرادیت بخش دی تھی اور وہ باقیوں سے ممتاز نظر آ رہا تھا۔

پریڈ کے دوران فوٹو گرافروں کے کیمرامینوں کے آلات کی گھوں گھوں مسلسل جاری تھی۔ وہ قلانچیں بھر کر پریڈ کے عین سامنے جاتے، قدرے توقف کرتے، رینگ کر پیچھے جاتے، ذرا کی ذرا گھٹنوں کے بل بیٹھتے، اور پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے، اور اور آگے کو بھاگتے۔ کبھی کبھار وہ کسی نامور شخص کو پکارتے، اور وہ شخص نادانستہ طور پر مڑ کر محض اتنی دیر کے لیے کھڑا ہو جاتا کہ یہ کھٹ سے اس کی تصویر کھینچ لیں۔

۱۸

کچھ نہ کچھ ہونے والا تھا۔ فضا میں اس کے آثار تھے۔ لوگوں کی رفتار میں سستی آ گئی تھی اور وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔

امریکی اداکارہ جو اپنے علی الرغم پریڈ کے دنبالے میں جا پڑی تھی، مزید اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکی اور اس نے جارحانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اب وہ بگ ٹٹ پریڈ کے طلیعے کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پانچ کلومیٹر کی دوڑ میں کوئی جوان، جو اپنی طاقت کو بچانے کے لیے پھسڈیوں کے ساتھ چلا آ رہا ہو، معاً قلانچیں بھر کے آگے کو بڑھا ہو، اور ایک ایک کر کے اپنے حریفوں سے آگے نکلتا چلا جا رہا ہو۔

پشیمان اور متحیر تبسم کے ساتھ مرد پیچھے ہٹ گئے کہ اس نامور دوڑنے والی کی فتح و کامرانی کی اس

جان توڑ کوشش میں کہیں کھنڈت نہ پڑ جائے۔ لیکن عورتوں نے نعرہ لگایا: ''واپس قطار میں آؤ! یہ کوئی فلمی ستاروں کی پریڈ نہیں!''

دھکم دھکا وہ بے محابا آگے بڑھے گئی۔ پیچھے پیچھے پانچ فوٹو گرافروں اور دو کیمرامینوں کی ٹولی گھسٹی چلی آ رہی تھی۔

اچانک ایک فرانسیسی عورت نے، جو لسانیات کی پروفیسر تھی، جھپٹ کر اداکارہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور (نہایت بھیانک قسم کی انگریزی میں) کہا: ''یہ پریڈ ڈاکٹروں کے لیے ہے جو جاں بلب کمبوڈین عوام کی خبر گیری کے لیے آئے ہیں۔ یہ فلمی ستاروں کی شہرت کا اسٹنٹ نہیں!''

اداکارہ کی کلائی لسانیات کی پروفیسر کی گرفت میں جکڑی ہوئی تھی، اور وہ ٹس سے مس نہ کر سکی۔ چنانچہ بھنا کر (نہایت رواں انگریزی میں) بولی: ''دماغ خراب ہو گیا ہے، کیا کر رہی ہو؟ میں اس قسم کی ہزاروں پریڈوں میں شریک ہو چکی ہوں۔ تم لوگ فلمی ستاروں کی مدد کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ یہ تو ہمارا عین مقصدِ حیات ہے! ہمارا اخلاقی فریضہ!''

''غلاظت!''[۳] لسانیات کی پروفیسر نے (نہایت رواں فرانسیسی میں) کہا۔

امریکی اداکارہ مطلب سمجھ گئی اور گھگھی رونے لگی۔

''ذرا ایک منٹ یہیں رک جائیے — پلیز!'' ایک کیمرامین نے آوازہ لگایا اور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اداکارہ نے ایک طویل لمحے کے لیے کیمرے کے لینس میں آنکھیں گڑو کے دیکھا؛ آنسو اس کے رخساروں پر رواں تھے۔

۱۹

آخرکار جب لسانیات کی پروفیسر نے اداکارہ کی کلائی چھوڑی، تو سیاہ داڑھی اور سفید جھنڈے والے جرمن پاپ سنگر نے اس کا نام پکارا۔

امریکی اداکارہ موصوف سے چنداں واقف نہ تھیں، لیکن اپنی ہیٹی ہونے کے بعد غیر معمولی طور پر ہمدردی کی جویا تھیں، چنانچہ بھاگ کر پاپ سنگر کے پاس پہنچ گئیں۔ پاپ سنگر نے جھنڈے کا عصا

۳۔ Merde: فرانسیسی لفظ۔ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں آج کل انگریزی کا لفظ shit۔ یعنی فضلہ۔

اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا اور دایاں ہاتھ اداکارہ کے کندھوں کے گرد ڈال دیا۔

دم کی دم میں فوٹوگرافروں اور کیمرا مینوں کا ایک اور غول بیابانی وہاں در آیا اور دونوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک مشہور و معروف امریکی فوٹوگرافر جسے ان دونوں کے چہروں کو اپنے ویو فائنڈر کے چوکھٹے میں فٹ کرنے میں دقت ہو رہی تھی، وہ اس لیے کہ جھنڈے کا ڈنڈا ضرورت سے زیادہ لمبا تھا، چند قدم پیچھے دھان کے کھیت میں ہٹا۔ اس کا قدم، دراصل، ایک بارودی سرنگ پر جا پڑا تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور اس کا جسم ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گیا، اور پاس کھڑے دانشوروں کو اپنے خون کی بارش سے تر کر گیا۔

پاپ سنگر اور اداکارہ کا خون خشک ہو گیا۔ انھوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ بس نظر اٹھا کر جھنڈے کو دیکھا جس پر جا بجا خون کے چھینٹے تھے۔ ایک بار پھر انھیں سانپ سونگھ گیا۔ پھر انھوں نے نظریں اوپر کیں اور دو چار بار ڈرتے ڈرتے دیکھا اور خفیف سا مسکرائے۔ ان کا سینہ ایک عجیب سے فخر سے بھر گیا تھا، ایسا فخر جس کا انھیں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ جھنڈا جو وہ اٹھائے ہوئے تھے، اسے خون کی بھینٹ نے مقدس کر دیا تھا۔ وہ پھر سے پریڈ میں جا شامل ہوئے۔

۲۰

سرحد ایک چھوٹی سی ندی سے بنی تھی، لیکن چونکہ ایک لمبی سی دیوار، جو کوئی چھ فٹ اونچی تھی اور جس کے سہارے فاصلے فاصلے پر تھائی شارپ شوٹروں کی مدافعت کے لیے ریت سے بھرے تھیلے پڑے تھے، اس سے لگ کر جاتی تھی، یہ نظر نہ آتی تھی۔ دیوار میں صرف ایک ہی جگہ پر رخنہ تھا، اور یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ایک پل دریا کے پار کو پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف ویت نامی افواج تھیں جو غنیم پر دھاوا بولنے کی گھات میں چھپی بیٹھی تھیں۔ ان کی نقل و حرکت پورے کیموفلاج میں تھی اور یہ بالکل نظر نہیں آتی تھیں۔ تاہم یہ صاف ظاہر تھا کہ جوں ہی کسی نے پل پر قدم رکھا، مخفی ویت نامی فوراً فائرنگ شروع کر دیں گے۔

پریڈ کے شرکا دیوار تک آئے اور پنجوں کے بل اٹھ اٹھ کر اس کے پار جھانکنے لگے۔ فرانز نے ریت کے دو تھیلوں کے درمیانی رخنے میں آنکھیں بھڑا کر دیکھا کہ پتا تو چلے آخر دوسری طرف ہو کیا رہا

ہے، لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ معاً ایک فوٹوگرافر صاحب نے، جن کے خیال میں وہ اس جگہ کے زیادہ مستحق تھے، دھکا دے کر فرانز کو وہاں سے ہٹا دیا۔

فرانز نے پیچھے نظر ڈالی۔ ایک اکیلے درخت کی گرانڈیل چوٹی میں، سات فوٹوگرافر کووں کے جھنڈ کی شکل دبکے بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں دوسرے کنارے پر جمی ہوئی تھیں۔

ٹھیک اسی لمحے ترجمان نے، جو پریڈ کے طلیعے میں تھی، ایک بڑا سا میگافون اٹھا کر اپنے لبوں سے لگایا اور پار والوں سے کھمیر (Khmer) زبان میں یوں مخاطب ہوئی: ''یہ لوگ ڈاکٹر ہیں اور کمبوڈیا کے علاقے میں داخل ہو کے طبی امداد پہنچانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اس کے مقاصد سیاسی نوعیت کے بالکل نہیں ہیں اور انھوں نے یہ قدم انسانی زندگی سے اپنے لگاؤ کی خاطر اٹھایا ہے۔''

جواب میں، دوسری طرف، قیامت کی خاموشی چھائی رہی۔ ایک ایسی مطلق خاموشی کہ سب کی ہمت جواب دے گئی۔ صرف کیمرے کھٹکتے رہے، اور ان کی آواز اس عالم سکوت میں کسی عجیب وغریب کیڑے کے نغمے کی طرح سنائی دیتی رہی۔

فرانز کو معاً محسوس ہوا کہ گرانڈ مارچ کا اختتام آ پہنچا ہے۔ یورپ خاموشی کی سرحدوں سے گھرا ہوا تھا، اور گرانڈ مارچ کا محل وقوع سمٹ سمٹا کر اب سیارے کے ٹھیک بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا چبوترا رہ گیا تھا۔ ازدحام، جو ابھی کچھ دیر پہلے تک طوفانِ بدتمیزی کی طرح اس چبوترے کے چاروں طرف امڈا آتا تھا، کب کا بکھر چکا تھا۔ گرانڈ مارچ مکمل عالم سکوت میں جاری تھی۔ اس کے دیکھنے کے لیے کوئی تماش بین نہ رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو ہے، فرانز نے خود سے کہا، گرانڈ مارچ، دنیا کی سرد مہری کے باوجود، جاری ہے، گو اس میں اعصابی ہیجان کی کیفیت اور بلا کا جوش آ گیا ہے: کل ویت نام پر امریکی قبضے کے خلاف، آج کمبوڈیا پر ویت نامی قبضے کے خلاف؛ کل اسرائیلیوں کی حمایت میں، آج فلسطینیوں کی موافقت میں؛ کل کیوبا کے حق میں، اور کلِ آئندہ کیوبا کے خلاف — اور ہمیشہ ہی امریکا کے خلاف: کبھی کبھار قتل عام کے خلاف، اور اوقاتِ دیگر قتلِ عام کے حق میں — یورپ مارچ کیے جا رہا ہے، آگے، اور آگے، مسلسل؛ اور اس کوشش میں کہ حالات اور واقعات سے متنبہ رہے اور اس خیال سے کہ ان میں سے کسی واقعے کو جاننے سے پیچھے نہ رہ جائے، اس کی چال لحہ لحہ غیر معمولی طور پر تیز ہوتی جا رہی ہے، تا آنکہ، انجام کار، گرانڈ مارچ ازدحام کے بھاگتے، جھپٹتے، قلانچیں بھرتے جلوس میں تبدیل ہو جاتی

ہے، جب کہ دوسری طرف وہ چبوترا مستقل چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہ سمٹ کر ابعاد سے عاری محض ایک نقطہ بن کر رہ جائے۔

۲۱

انٹرپریٹر ایک بار پھر میگافون میں منھ دے کر چلائی۔ ایک بار پھر جواب میں بے حد و کنار، سرد مہر خاموشی نے خیر مقدم کیا۔

فرانز نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دریا کے پار کی بسیط خاموشی ان کے چہروں پر طمانچے کی طرح آکر پڑی تھی۔ گمبھیر مایوسی نے نہ صرف سنگر کو بلکہ امریکی اداکارہ کو بھی آلیا تھا۔ مزید کچھ کرنے سے وہ اب باقاعدہ جھجک رہے تھے۔

بصیرت کے ایک کوندے میں فرانز کو ان سب کی حالت سخت مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ لیکن اس خیال نے بجائے فرانز کو اس بے چاری خلقت سے علیحدہ کرنے یا خود اس کو طنز سے بھر دینے کے، ایسی بیکراں شفقت سے مالا مال کر دیا جو ہم سب ایسے لوگوں کے لیے محسوس کرتے ہیں جنھیں گردن زدنی قرار دیا جا چکا ہو۔ ٹھیک ہے، گرانڈ مارچ اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی، لیکن اب اس کا مطلب یہ تو نہیں نکلتا تھا کہ فرانز اس کے ساتھ دغا کرے۔ خود اس کی زندگی بھی تو انجام کو پہنچ رہی تھی۔ بہادر ڈاکٹروں کی معیت میں سرحد کی طرف رواں دواں انبوہ کے جذبۂ نمائش پر طعنہ زن ہونے والا وہ کون ہوتا ہے؟ سوائے دکھاوے کے ان کے پاس اور چارہ ہی کیا رہ گیا تھا؟ اس معاملے میں ان کے لیے انتخاب کی کون سی راہیں کھلی تھیں؟

فرانز کے محسوسات بالکل درست تھے۔ اس موقعے پر میں پراگ کے اس مدیر کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے سیاسی قیدیوں کی معافی کے لیے ایک عرضی دعوے کا اہتمام کیا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس درخواست سے قیدیوں کا بالکل بھلا ہونے والا نہیں۔ اس کا اصلی مقصد قیدیوں کی رہائی تھا بھی نہیں۔ وہ تو یہ ثابت کرنے کی دھن میں تھا کہ دنیا میں نڈر لوگ اب بھی موجود ہیں۔ اب دیکھیے تو یہ بھی ایک طرح کی اداکاری ہی تھی۔ کوئی اور امکان اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ اداکاری اور عمل کے درمیان انتخاب کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ اداکاری اور کسی بھی عمل سے انحراف کے

درمیان انتخاب کا معاملہ۔ زندگی میں ایسی صورتِ حال بھی آتی ہے جب آدمی اداکاری پر مجبور ہو جاتا ہے۔ گونگی طاقتوں سے اس کی جدوجہد (مثلاً دریا کے پار کی گونگی طاقت، یا وہ پولیس جو دیواروں میں خفتہ گونگے مائکروفونوں میں بدل گئی ہو) کی مثال اس تھیٹر کمپنی کی جدوجہد ہے جس نے ایک مسلح فوج پر حملہ بول دیا ہو۔

فرانز اپنے ساربون (Sorbonne) والے دوست کو مکا اٹھا کر دوسرے طرف پھیلی ہوئی خاموشی کو ڈراتے دھمکاتے دیکھا کیا۔

۲۲

پھر تیسری بار ترجمان نے میگا فون کے ذریعے للکارا۔

اس بار بھی اتھاہ خاموشی نے جواب دیا۔ لیکن اس بار فرانز کی ساری یاسیت اچانک ایک حیرت انگیز قہر میں بدل گئی۔ وہ یہاں کھڑا تھا، اس پل سے بس تھوڑی ہی دور جو تھائی لینڈ کو کمبوڈیا سے ملاتا تھا۔ اچانک اس پل پر بے محابا دوڑ جانے، آسمان کو بے نقط سنانے، اور گولیوں کی پرشور گونج میں جان دے دینے کی منہ زور خواہش اس میں ابھری۔

فرانز کی یہ اچانک خواہش ہمیں کس چیز کی یاد دلاتی ہے؟ جی بالکل، اسٹالن کے سپوت کی، جو خود کو بجلی کے کوندے سے مارنے کی خواہش میں خاردار تار کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اور یہ اس وقت جبکہ یہ تاب اس میں نہ رہی کہ انسانی وجود کے دونوں قطبوں کو اتنے قریب آتا دیکھے کہ وہ ایک دوسرے کو چھو لیں۔ جب رفیع اور رذیل، مکھی اور فرشتے، خدا اور فضلے کے درمیان کوئی فرق نہ باقی بچے۔

فرانز نے یہ ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ گرانڈ مارچ کی عظمت مارچ کرنے والوں کی مضحکہ خیز خود بینی کے مترادف تھی، کہ یورپی تاریخ کا بانکا شور و شغب ایک لامتناہی سکوت میں ڈوب چکا تھا، کہ اب تاریخ اور سکوت میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ترازو میں خود اپنی زندگی رکھ دے اور ثابت کر دکھائے کہ گرانڈ مارچ فضلے کے مقابلے میں بہرحال کہیں زیادہ وزنی شے ہے۔

لیکن آدمی اس قسم کی کوئی چیز ثابت نہیں کر سکتا۔ ترازو کے ایک پلڑے میں فضلہ پڑا تھا اور دوسرے میں اسٹالن کے بیٹے کا پورا جسم۔ اس کے باوجود پلڑوں میں خفیف سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔

اپنے کو گولی لگوانے کی بجائے فرانز نے محض سوگواری سے اپنا سر جھکا لیا اور دوسروں کے ساتھ ساتھ، واحد قطار، بسوں کی طرف لوٹ گیا۔

۲۳

ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ دوسرے کی نگاہوں میں رہیں۔ جس قسم کی نگاہ کی نگرانی میں ہم زندگی کی خواہش کرتے ہیں اس کے اعتبار سے ہماری چار اصناف میں درجہ بندی ہو سکتی ہے۔

پہلی صنف میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی تمنا ہوتی ہے کہ گمنام آنکھوں کی ایک لامحدود تعداد ہمہ وقت ان پر مرتکز رہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ لوگ جو عوام کی توجہ کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہ بات جرمن پاپ سنگر، امریکی اداکارہ، حتیٰ کہ اس طویل قامت، خمیدہ کمر اور نکلی ہوئی ٹھوڑی والے مدیر پر بھی صادق آتی ہے۔ یہ مدیر اپنے قارئین کی توجہ کا عادی تھا۔ ایک دن جب روسیوں نے اس کے اخبار کو ممنوعہ قرار دے دیا تو اچانک اسے محسوس ہوا کہ فضا سو درجہ لطیف ہو گئی ہے۔ کون چیز گمنام آنکھوں کی حریف ہو سکتی ہے! چنانچہ اسے بڑی گھٹن محسوس ہوئی، لگا کہ دم ہی نکل جائے گا۔ پھر ایک دن اسے محسوس ہوا کہ اس کا متواتر تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس کی رہائش گاہ میں اس کی نقل و حرکت اور گفتگو پر نظر رکھنے کے لیے خفیہ آلات لگا دیے گئے ہیں، اور چھپ چھپاتے گلی کوچوں میں اس کی تصویریں اتاری جا رہی ہیں۔ بس جناب، اب کیا تھا۔ جوں ہی یہ گمنام آنکھیں اس کے سراپے پر مرتکز ہوئیں، اسے لگا کہ وہ دوبارہ سانس لینے کے قابل ہو گیا ہے۔ گھر کی دیواروں میں چھپے مائکروفونوں کے سامنے جا کر وہ باقاعدہ نمائشی تقریریں کرنے لگا۔ وہ عوام جنھیں وہ اخبار بند کر دیے جانے کے باعث کھو چکا تھا، انھیں اس نے پولیس کے روپ میں پا لیا تھا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو صرف بعض جانی پہچانی آنکھوں ہی سے دیکھے جانے کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کاک ٹیل اور ڈنر پارٹیوں میں میزبانی کے فرائض انجام دیتے نہیں تھکتے۔ پہلی قسم کے مقابلے میں، جو اپنی پبلک کے ہاتھ سے نکل جاتے ہی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی کے در و دیوار تیرہ و تاریک ہو گئے ہیں، یہ لوگ زیادہ پرمسرت ہوتے ہیں۔ جہاں پہلی قسم والے جلد یا بدیر، اور کم و بیش سب ہی عوام کی توجہ کے ہٹتے ہی، زندگی کی تاریکی

کا تجربہ کرتے ہیں، وہاں دوسری قسم والے ہمیشہ ایسی آنکھوں کو فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ ماری کلود (Marie-Claude) اور اس کی بیٹی کا شمار اسی صف میں ہوتا ہے۔

تیسری قسم والے خود کو ہمہ وقت اپنے محبوب کے سامنے دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ان کی حالت بھی اتنی ہی خطرناک ہوتی ہے جتنی قسم اول والوں کی۔ ایک دن ان کے محبوب کی آنکھیں بند ہو جائیں گی، اور ان کا کمرہ تاریکی میں ڈوب جائے گا۔ تیریزا اور طوماش کا شمار اسی قسم میں ہوتا ہے۔

آخرا، چوتھی قسم ہے۔ یہ نادر روزگار قسم ہے اور اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو غائب اور مفقود کی خیالی آنکھوں میں زندگی کرتے ہیں۔ یہ خواب دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً فرانز۔ صرف سبینا کی خاطر اس نے کمبوڈیا کی سرحد تک کا سفر کیا۔ جب بس تھائی لینڈ کی ایک سڑک پر دھکے کھاتی جا رہی تھی، اس وقت وہ سبینا کی نظروں کو اپنے اوپر ثبت محسوس کر سکتا تھا۔

طوماش کے لڑکے کا شمار بھی اسی قسم میں ہوتا ہے۔ میں اسے سائمن کا نام دیتا ہوں۔ (وہ یہ جان کر یقیناً خوش ہوگا کہ اس کے باپ کے نام کی طرح خود اس کا نام بھی بائبل سے لیا گیا ہے۔) جن آنکھوں کا وہ آرزومند تھا، وہ طوماش کی آنکھیں تھیں۔ پٹیشن والی مہم میں ملوث ہونے کے نتیجے میں اسے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ جس لڑکی سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا، وہ گاؤں کے پادری کی بھتیجی تھی۔ اس نے اس سے شادی کی، ایک کلیکٹیو فارم (collective farm) پر ٹریکٹر ڈرائیور بنا، عملی کیتھولک بھی، اور وقت آنے پر باپ بھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ طوماش بھی اسی گاؤں میں اقامت گزیں ہے، تو اس کے دل میں اہتزاز کی لہر دوڑ گئی۔ قسمت دونوں کی زندگیوں کو کس درجے قریب لے آئی تھی۔ اس بات سے اسے طوماش کو خط لکھنے کا حوصلہ ہوا۔ لیکن اپنے خط میں اس نے طوماش سے جواب دینے کی درخواست نہ کی۔ وہ صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ طوماش اس کی زندگی کی طرف اپنی نظریں منعطف کر دے۔

۲۴

فرانز اور سائمن اس ناول کے خواب دیکھنے والے کردار ہیں۔ فرانز کے برعکس سائمن کو اپنی ماں کبھی پسند نہ آ سکی۔ بچپن ہی سے اسے اپنے باپ کی جستجو رہی تھی۔ وہ اس بات پر قطعی آمادہ تھا کہ اپنے باپ کو کسی ناانصافی کا ہدف مانے، ایسی ناانصافی جو ان تمام ناانصافیوں سے جو اس کے باپ نے اس

کے ساتھ کی تھیں، نہ صرف یہ کہ زمانی اعتبار سے پہلے تھی، بلکہ ان کی وجہ جواز بھی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے لیے کبھی غصہ محسوس نہ کیا، کیونکہ وہ اپنی ماں کا، جو مسلسل اس کے باپ کو بدنام کرتی رہتی تھی، حلیف بننے کا بالکل متمنی نہ تھا۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ اٹھارہ سال کی عمر تک، یعنی سیکنڈری اسکول پاس کرنے تک رہا، پھر پراگ آ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت طوماش کھڑکیاں دھونے کے کام پر لگا ہوا تھا۔ طوماش سے بظاہر اتفاقیہ ملاقات کی خاطر سائمن اکثر گھنٹوں انتظار کیا کرتا۔ لیکن طوماش اس سے بات کرنے کے لیے کبھی لمحہ بھر بھی نہ رکا۔

اس بڑی سی ٹھوڑی والے سابق مدیر سے اس کے تعلق کی تنہا وجہ یہ تھی کہ مدیر اور اس کا باپ دونوں ہی قسمت کے مارے ہوئے تھے، اور مدیر کی شومیِ قسمت دیکھ کر اسے اپنے باپ کی بدبختی یاد آ جاتی تھی۔ مدیر نے تو کبھی طوماش کا نام تک نہ سنا تھا۔ خود سائمن ہی نے مدیر سے اس مضمون کا ذکر کیا تھا اور پھر یہ درخواست کہ وہ کسی نہ کسی طرح طوماش کو پٹیشن پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ کر لے۔ مدیر نے صرف اس لیے ہامی بھر لی تھی کہ یہ نوجوان اسے عزیز تھا اور وہ اس کے لیے کوئی نیک کام کرنا چاہتا تھا۔

جب بھی سائمن کو باپ بیٹے کی ملاقات والا دن یاد آتا تو اپنی جھجھک اور لرزہ براندام کیفیت پر بڑی ندامت محسوس ہوتی۔ ظاہر ہے، اس کا باپ اسے پسند کرتا بھی تو آخر کیسے؟ اس کے برعکس، اسے اپنا باپ بہت پسند تھا۔ اسے اپنے باپ کا کہا ہوا ہر ہر لفظ ازبر تھا۔ اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوتا گیا کہ ان الفاظ میں کس قدر صداقت تھی۔ جن الفاظ نے اسے بے حد متاثر کیا تھا وہ یہ تھے، ''لوگوں کو سزا دینا، جنھیں نہیں معلوم کہ وہ کس جرم کا مرتکب ہوئے ہیں، نہایت بہیمانہ فعل ہے۔'' جب اس کی محبوبہ کے چچا نے اس کے ہاتھ میں بائبل تھمائی، تو وہ عیسیٰ کے ان الفاظ سے بھی خاص طور پر متاثر ہوا تھا: ''انھیں بخش دو، کہ انھیں نہیں معلوم کہ یہ کیا کر رہے ہیں!'' اپنے باپ کی مذہب سے عدم اعتقادی اس پر خوب عیاں تھی۔ لیکن ان دونوں اقوال کی حیرت انگیز مماثلت میں اسے غیب سے دی جانے والی نشانی کا احساس ہوا۔ یہی کہ جس راہ کا اس نے اپنے لیے انتخاب کیا تھا، اس کا باپ اس راہ سے بالکل متفق تھا۔

گاؤں کے ماحول میں رہتے ہوئے تقریباً تین سال کے عرصے میں اسے طوماش کی جانب سے

صرف ایک خط موصول ہوا جس میں آ کر طوماش سے ملاقات کی دعوت دی گئی تھی۔ ملاقات خاصی دوستانہ رہی۔ سائمن نے خود کو بالکل پرسکون محسوس کیا اور ذرا بھی نہ ہکلایا۔ لیکن شاید وہ یہ اندازہ نہ کر سکا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بات پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھے۔ تقریباً چار ماہ بعد اسے ایک تار ملا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ طوماش اور اس کی بیوی ٹرک کے نیچے آنے سے کچل کر مر گئے تھے۔

ٹھیک اسی زمانے میں اسے ایک عورت کے بارے میں پتا چلا جو کبھی اس کے باپ کی داشتہ رہ چکی تھی اور فی الوقت فرانس میں اقامت گزیں تھی۔ جانے کیسے کیسے جتن کر کے اس نے بالآخر اس عورت کا پتا حاصل کر لیا۔ اور چونکہ اسے ایک ایسی تخیلی آنکھ کی اشد ضرورت تھی جو اس کی حیات کے گزران پر مرکوز ہو، وہ وقتاً فوقتاً اس عورت کو بڑے طویل طویل خط لکھتا۔

۲۵

اپنی زندگی کے آخری ایام تک سبینا کو اپنے سوگوار دیہاتی نامہ نگار کی جانب سے برابر خط ملتے رہے۔ ان میں سے بیشتر تو کھول کر کبھی پڑھے تک نہ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سبینا کی اپنے وطن سے دلچسپی دن بدن کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ بوڑھا بالآخر مر کھپ گیا، اور سبینا کیلی فورنیا چلی آئی۔ یعنی کچھ اور دور مغرب، اپنے پیدائشی ملک سے کچھ اور دور۔

اسے اپنی پینٹنگز کو فروخت کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ امریکا اسے پسند ضرور تھا، لیکن سطحی طور پر۔ زیرِ سطح ہر چیز اس کے لیے مکمل اجنبی تھی۔ نیچے، بہت نیچے، نہ کوئی دادا نانا تھا، نہ کوئی چچا۔ اسے خود کو قبر میں اتار کر امریکی زمین میں روپوش ہو جانے کے خیال سے خوف آتا تھا۔

چنانچہ ایک دن اس نے اپنا وصیت نامہ مرتب کیا جس میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ بعد از مرگ اس کی لاش کو نذرِ آتش کر دیا جائے اور اس کی راکھ ہوا میں منتشر۔ تیریزا اور طوماش ثقل کی علامت کے نیچے اپنے انجام کو پہنچے تھے، اور وہ لطافت کے نشان کے نیچے مرنا چاہتی تھی۔ اس صورت میں وہ ہوا سے زیادہ لطیف ہو گی اور، جیسا کہ پارمے نی ڈیز (Parmenides) نے کہا ہے، منفی مثبت میں بدل جائے گا۔

۲۶

بس بینکاک ہوٹل کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ اب کسی کو جلسے جلوس کا اشتیاق نہیں رہا تھا۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر قابلِ دید مقامات کی سیر کو نکل پڑے۔ چند ایک مندروں کی زیارت کو چل دیے، چند ایک قحبہ خانوں کی طرف۔ فرانز کے سار بون والے دوست نے شام اکھٹے گزارنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن فرانز اس وقت محض تنہا وقت گزارنا چاہتا تھا۔

جب وہ سڑک پر نکلا تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ وہ سبینا کے خیال میں گم تھا۔ اُسے سبینا کی آنکھیں اپنے اوپر جمی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جب بھی اسے لگا کہ وہ اُسے ٹکٹکی باندھے تک رہی ہے، اسے اپنے بارے میں شک نے آ گھیرا: اسے سبینا کی اصل سوچ کا وثوق سے کبھی پتا نہ چل سکا تھا، اور آج بھی اس خیال کے آتے ہی وہ خاصا بے راحت ہو گیا۔ وہ اس کا مضحکہ تو نہیں اڑا رہی؟ جس طرح اس نے بڑھا چڑھا کر اسے باقاعدہ ایک کلٹ (cult) کی شکل دے دی تھی، تو کیا یہ بات سبینا کو نہایت احمقانہ تو نہیں معلوم ہوتی تھی؟ کیا وہ اسے یہ بتانے کی کوشش تو نہیں کر رہی تھی کہ میاں، وقت آ گیا ہے کہ بچپنا چھوڑ کر باقاعدہ بالغ آدمی کی جون میں آ جاؤ اور خود کو اپنی داشتہ کے لیے وقف کر دو، وہ داشتہ جسے خود سبینا نے اس کو بھیجا تھا؟

جیسے ہی وہ بڑے بڑے گول عدسوں میں دھنسا چہرہ اس کے تصور میں لہرایا، فرانز کو معاً خیال آیا کہ وہ اپنی طالب علم داشتہ کے ساتھ کتنا مسرور رہا تھا۔ اچانک کمبوڈیا والی مہم اسے بڑی بے معنی اور اتنی ہی مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ وہ یہاں کس لیے آیا تھا؟ اب کہیں جا کر اسے اس کا صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ نہ پریڈیں اور نہ سبینا، بلکہ ایک چشمے والی لڑکی ہی اس کی اصلی کائنات ہے، اس کی تنہا حقیقی کائنات۔ وہ یہ جاننے کے لیے آیا تھا کہ حقیقت خواب سے زیادہ کوئی شے ہے، خواب سے کہیں زیادہ!

اچانک نیم اندھیرے سے ایک شبیہ ابھر کر اس کے سامنے آئی اور ایک نامانوس زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اس نے اس ناخواندہ مہمان پر ایک نظر ڈالی جس میں بدحواسی تو خیر تھی ہی، ساتھ ساتھ ہمدردی کا شائبہ بھی تھا۔ آدمی احتراماً جھکا، خوش خلقی سے مسکرایا، اور پھر بڑے تعمیل طلب انداز میں کچھ

بڑبڑایا۔ وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہا تھا؟ وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ آدمی نے فرانز کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی قیادت کرنے لگا۔ فرانز نے یہ نتیجہ نکالا کہ کہیں کوئی شخص اس کی مدد چاہتا ہے۔ تو پھر اس کے یہاں، اتنی دور، آنے کے کچھ نہ کچھ معنی تو ضرور نکلتے ہیں! کیا پردہ غیب سے اسے کسی کی اعانت کے لیے نہیں بلایا جا رہا تھا؟

اچانک مزید دو شخص کہیں سے آ ٹپکے اور پہلے آدمی کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان میں ایک نے انگریزی میں فرانز سے کہا کہ اپنی ساری نقدی اس کے حوالے کر دے۔

چشمے والی لڑکی فوراً اس کے خیالوں سے غائب ہو گئی، اور سبینا کی آنکھیں اس کے سراپے پر آ جمیں ـــــ وہ سبینا جو بڑی غیر حقیقی تھی، جو بڑی عالی شان قسمت کی مالک تھی، جس نے اسے خود کو بے حد خفیف محسوس کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جس کی قہر آلود نگاہیں اس میں ٹھیک برے کی اَنی کی طرح پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں بلا کا خشم تھا اور بلا کی بے اطمینانی: تو کیا ایک بار پھر اس کے ساتھ جعل ہوا ہے؟ کسی اور شخص نے بھی اس کی احمقانہ خوش خُلقی سے فائدہ اٹھایا ہے؟

اس نے جھٹک کر اپنا بازو آدمی کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ مگر اب وہ آدمی فرانز کی آستین پکڑے ہوئے تھا۔ فرانز کو یاد آیا کہ سبینا نے ہمیشہ اس کی طاقت کو تحسین کی نظر سے دیکھا تھا۔ اتنے میں ایک اور آدمی کا ہاتھ تیزی سے اس کے خلاف اٹھا۔ فرانز نے اسے ہوا ہی میں اچک لیا اور جوڈو کا کوئی مجرب پینترا استعمال کر کے اسے اپنے کندھوں پر سے اچھال کر پھینک دیا۔

اب وہ اپنے سے بالکل مطمئن تھا۔ سبینا کی نظریں ہنوز اس پر ثبت تھیں۔ وہ اب کبھی اسے خود کو ذلیل کرتا ہوا نہ دیکھے گی۔ کبھی پسپا اور میدان چھوڑ کر بھاگتا ہوا نہیں دیکھے گی۔ لجلجی جذباتیت اور رقیق القلبی سے فرانز کا پیٹ بھر چکا تھا۔

ان آدمیوں کے لیے اس نے ایک عجیب سی بشاش حقارت محسوس کی۔ ہنہ! یہ سوچ کر آئے تھے کہ فرانز اور اس کی سادہ لوحی پر بھرپور قہقہہ لگانے کا موقع ملے گا! وہ بقیہ دو آدمیوں کے درمیان شانے جھکائے کھڑا باری باری انھیں دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے سر پر ایک شدید ضرب محسوس ہوئی اور وہ چکرا کر زمین پر آ رہا۔ اسے مبہم سا احساس تھا کہ اسے اٹھا کر کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ پھر محسوس ہوا کہ اسے خلا میں پھینک دیا گیا ہے اور وہ گرا چلا جا رہا ہے۔ ایک اور بے پناہ شدید ضرب، اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ جنیوا کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا تھا، اور ماری کلود اس کے بستر پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ماری کلود سے کہہ دے کہ اسے یہاں آنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ عملے سے کہہ کر چشمے والی لڑکی کو فوراً اپنے پاس بلوالے۔ اس کے تمام تر خیالات صرف اسی پر مرکوز تھے۔ وہ بہ بانگِ دہل اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے پہلو میں اس کے سوا کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک خوف کے ساتھ اس پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر حقارت سے لبریز آنکھوں سے ماری کلود کو دیکھا اور چاہا کہ منھ پھیر کر دوسری طرف کروٹ لے لے، لیکن معلوم ہوا کہ اس میں اپنا جسم ہلانے تک کی سکت نہیں رہی۔ ممکن ہے اس کا سر ہل سکے؟ وہ اپنا سر بھی نہ ہلا سکا۔ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں تا کہ ماری کلود اسے نظر نہ آ سکے۔

۲۷

اپنی موت میں، انجام کار، فرانز اپنی بیوی کا ہو رہا۔ اور ایسا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ماری کلود نے تجہیز و تکفین کا جملہ انتظام خود کیا: کفن دفن کا سارا کھٹ راگ، اس کی موت کے اطلاعی کارڈ بھی خود ہی بھیجے، خود ہی جا کر پھولوں کے ہار خریدے، اور اپنے لیے ایک کالا ماتمی ــــ بلکہ حقیقتاً شادی کا ــــ ڈریس بھی خود ہی بنوایا۔ ٹھیک ہی تو ہے، شوہر کی تجہیز و تکفین کا موقع بیوی کی حقیقی شادی ہی کا موقع تو ہوتا ہے! اس کی ساری زندگی کی تمام تر جستجو اور عمل کا نقطۂ عروج! اس کے سارے دکھ کا اجر!

پادری (pastor) کو ان سب باتوں کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ میت کو قبر میں اتارنے سے قبل جو خطبہ دیا جاتا ہے اس میں اس نے ایک ایسی ازدواجی محبت کا ذکر کیا جو زمانے کی کڑی آزمائشوں سے گزرنے کے باوجود مرنے والے کے لیے گوشۂ عافیت رہی تھی، ایسا گوشۂ عافیت جہاں وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر کے واپس جا رہا تھا۔ فرانز کے ہم منصب رفقا نے بھی، جن کو ماری کلود نے قبر پر تقریر کرنے کی دعوت دی تھی، اصلاً مرنے والے کی بہادر بیوی کو ہی خراج عقیدت پیش کیا۔

جنازے میں کہیں بہت پیچھے، ایک دوست کے کندھوں کا سہارا لیے، بڑے بڑے چشموں والی لڑکی کھڑی تھی۔ مختلف النوع ادویہ کی گولیوں کے استعمال اور سسکیوں کے طوفان کو دبائے رکھنے کی جان لیوا کوشش کی وجہ سے رسمِ تکفین کے اختتام سے پہلے ہی، اس پر مروڑ کا شدید دورہ پڑا۔ وہ پیٹ پکڑ کر

آگے کولڑکھڑائی، اور اس کا دوست سہارا دے کر اسے وہاں سے باہر لے آیا۔

۲۸

کلیکٹیو فارم کے صدر کا خط ملتے ہی وہ اچک کر اپنی موٹر سائیکل پر جا سوار ہوا، اور کفن دفن کا انتظام کرنے عین وقت پر جا پہنچا۔ باپ کی لوحِ مزار پر نام کے نیچے وہ یہ کتبہ دیکھنا چاہتا تھا: "یہ خدا کی بادشاہت زمین پر دیکھنے کا خواہاں تھا!"

اسے خوب معلوم تھا کہ اس خیال کے اظہار کے لیے اس کے باپ نے بالکل مختلف الفاظ چنے ہوتے لیکن جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، تو یہ جذبات عین اس کے باپ کے ہی تھے۔ خدا کی بادشاہت کا مطلب انصاف ہے، اور طوماش نے ایسی دنیا کی آرزو کی تھی جہاں انصاف کا بول بالا ہو۔ کیا سائمن کو اپنے باپ کے جذبات کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کا حق حاصل نہ تھا؟ ظاہر ہے کہ تھا۔ کیا تمام وارثین کو زمانہ قدیم سے یہ استحقاق نہیں رہا؟

لیکن فرانز کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ تھی: "جہاں گردی کی واپسی ـــــ طول طویل سیاحت کے بعد!" اب ایسا نہیں تھا کہ اس کی مذہبی رنگ میں ترجمانی نہ کی جا سکتی ہو۔ یعنی کہ سیاحت مترادف ہے ہماری حیاتِ ارضی کے، اور ہماری رجعت دراصل خدا کی طرف رجعت ہے۔ تاہم اقربا کو خوب معلوم تھا کہ اس عبارت کا ایک دنیاوی مفہوم بھی نکلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ماری کلود اس مفہوم کا روز ہی اظہار کرتی تھی:

فرانز، پیارا، شیریں فرانز! ادھیڑ عمر کے جس بحران سے مرد دوچار ہوتے ہیں، وہ واقعی اس کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا۔ اور وہ قابلِ رحم لونڈیا جس نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا! اف، حد تو یہ ہے کہ وہ خوبصورت تک نہ تھی! (تم نے اس کا وہ بڑے بڑے عدسوں والا چشمہ نہیں دیکھا جس کے پیچھے وہ اپنی بدصورتی چھپاتی تھی؟) لیکن جب یہ مردوے پچاس کے پیٹے میں آتے ہیں تو (خوب معلوم ہے) تازہ گوشت کے ایک لوتھڑے کے لیے اپنی روح تک بیچ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک بیوی ہی جانتی ہے کہ اس بحران سے اس کا شوہر کس اذیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ فرانز کے لیے ایک باقاعدہ تعذیب، اخلاقی تعذیب کے مساوی تھا، کیونکہ اپنے باطن میں فرانز ایک رحم دل اور شریف

النفس آدمی تھا۔ ورنہ پھر آپ ہی بتایئے کہ اسے اس احمقانہ ٹرپ پر ایشیا، یا جہاں بھی وہ جگہ رہی ہو، جانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ وہ وہاں موت کی تلاش میں گیا تھا۔ جی ہاں، ماری کلود اس بات کو صداقتِ مطلق کے طور پر جانتی تھی: فرانز، بقائمی ہوش وحواس، موت کا خواہاں تھا۔ اپنے آخری ایام میں، جب وہ عازمِ ملکِ عدم تھا، اور جھوٹ بولنے کی اسے چنداں ضرورت نہ تھی، اس نے صرف ماری کلود کو دیکھنے کی خواہش کا ہی اظہار کیا تھا، کسی اور کو دیکھنے کا نہیں۔ قوتِ گویائی سے محروم ہو جانے کے باوجود اس نے کس کس طرح نہ آنکھوں سے ماری کلود کا شکریہ ادا کیا تھا! اس نے ماری کلود پر اپنی آنکھیں ثبت کر کے اسے معاف کر دینے کی التجا کی تھی، اور ماری کلود نے اسے معاف بھی کر دیا تھا۔

۲۹

کمبوڈیا کے مرتے عوام کا مآل؟

ایک بڑی سی تصویر جس میں ایک امریکی اداکارہ ایک ایشیائی بچے کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے۔

طوماش کا کیا بنا؟

لوحِ مزار پر ایک کتبہ: یہ خدا کی بادشاہت زمین پر دیکھنے کا خواہاں تھا!

بیتھوون (Beethoven) کا کیا بچا ہے؟

پیشانی پر ناپسندیدگی کی ایک شکن، گردن کے ناگفتنی بال، اور ایک گمبھیر آواز جو گنگنا رہی ہے، ''یہ تو ہونا ہی تھا!''[۴]

فرانز کا انجام؟

ایک کتبہ جس پر یہ عبارت کندہ ہے: جہاں گردی کی واپسی — طول طویل سیاحت کے بعد!

وغیرہ وغیرہ! ہم اپنے بھلا دیے جانے سے پہلے ہی کچ میں تبدیل کر دیے جائیں گے۔ وجود اور نسیاں کی درمیانی منزل کچ ہے۔

❄

۴۔ یہاں جرمن کا فقرہ استعمال ہوا ہے: .Es muss sein۔ انگریزی: .It must be۔ اردو: یہ تو ہونا ہی تھا۔

امین مالوف

❄

عامِ زنِ جَرکَسی

امین مالوف ایک لبنانی صحافی اور ادیب ہیں، جنھوں نے پچھلے چند برسوں سے پیرس میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے *Leon l'Africain* کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک ناول لکھا تھا۔ یہ ناول ۱۹۸۶ء میں شائع ہوتے ہی بے حد مقبول ہوا۔ تین سال بعد اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ کر آ گیا، جو پیٹر سلگلٹ (Peter Sluglett) نے *Leo Africanus* کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جس کا تار و پود مالوف نے حسن الوزان نامی ایک جغرافیہ داں کی تخیلی آپ بیتی کے گرد بنا ہے۔ میں اس ناول کی تیسری کتاب کے دوسرے باب کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں، جو انگریزی متن سے کیا گیا ہے۔ اس باب میں مالوف نے ایک معمولی سی عشقیہ کہانی بیان کی ہے — ''معمولی سی''، بظاہر! — کیونکہ اس میں قوم وملت کی اصلاح کا کوئی جلی یا خفی دعویٰ نہیں، جس سے ہم سب ترقی پسندی کی کسی نہ کسی شکل میں دیر تک آگاہ رہے ہیں، اور نہ اس میں جدیدیت کے نام پر وہ بے محابا قلابازیاں نظر آتی ہیں جن سے ہند و پاک کا کوئی رسالہ آج محفوظ نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ''ترقی پسند'' اور ''جدید'' کہانیوں کا روکھا پھیکا راتب زہر مار کرتے کرتے میری طبیعت اس درجہ منغض ہو گئی ہے کہ سیدھی سادی عشقیہ کہانیوں کی طرف دوڑتا ہوں۔ عبداللہ حسین نے شاید صحیح کہا ہے کہ ہر کہانی، بہرطور، کسی نہ کسی محبت کی کہانی ہی ہوتی ہے۔ عبداللہ نے ''محبت'' وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے: ایک حرکی قوت جو ہمارے ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ افعال کے پیچھے موج زن ہوتی ہے۔

اس کہانی میں ''حسن'' نہ اپنے تغافل میں جرأت آزما ہے، نہ جسم و جاں کے تقاضوں کے اظہار میں مظاہراتی۔ دوسری طرف ''عشق'' اپنی برانگیختگی میں توانا سہی، بے وقار نہیں۔ یہ توازن ہی اس کہانی کی جان ہے۔ ایک دھیما پن؛ ایک قابلِ برداشت — اور اتنی ہی دلنواز — حسرت؛ زندگی کا حزنیہ احساس، جو دشنام طرازی کی ادنیٰ ترین کوشش کا بھی سزاوار نہیں؛ عورت کی خود آگاہ سپردگی؛ مرد کی باوقار بے تابی؛ زبان کی تلمیحی وسعت، جس سے پیدا شدہ نت نئے تلازمے احساس کی رگ رگ میں ایک جان دار لمس کو جگا دیتے ہیں؛ اور سب سے بڑی بات یہ

کہ یہاں تعلقِ خاطر یک طرفہ نہیں، اور نہ ہی اس میں اَنائے بے جا کا گھمس ہے، بلکہ اس کی پرورش باہم پاسداری کے ارفع ترین اصولوں پر ہوئی ہے۔ یہاں مرد عورت کو استعمال نہیں کر رہا، بلکہ جسم بڑی صحت مند بے قراری کے ساتھ اپنے ہم نفس کا جویا ہے۔ آخراً، یہ زندگی کا، اس کی تمام مجبوریوں کے باوصف، جشن ہے!

ترجمے میں سخت مقام تو وہاں آیا جہاں نور کہتی ہے: ''میری جگہ دوسری عورتیں ہوتیں تو سب سے پہلے اپنے مانوس اور شخصی زیور بیچ دیتیں... '' اسے intimate jewelry کا بس کام چلاؤ ترجمہ ہی سمجھیے۔ اس میں بھلا ''وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!'' ''ان ٹی میٹ'' میں رازداری کا جو رنگ ہے، اور دبی دبی جنسیت کی جو آنچ ہے، ''شخصی''، ''ذاتی''، ''مانوس''، وغیرہ اس کے کہاں متحمل ہو سکتے ہیں۔ کوئی مناسب متبادل لفظ سوجھا نہیں، جسے، بہرحال، میری اردودانی کے سقم پر محمول کیجیے۔ الغرض، آپ کا پتا نہیں، ''ان ٹی میٹ جیولری'' کے بس ذکر ہی سے میرے تصور میں نور اپنی تمام ہستی کے ساتھ مجسم ہو جاتی ہے، اور میرے مشام اس کی نسوانیت کی ــــ اور صرف اسی کی نسوانیت کی ــــ مخصوص بوباس سے مہکنے لگتے ہیں۔

''جرکسی'' سے مراد Circassian قوم کا فرد ہے۔ ''جرکس'' شمال غربی قفقاز کے قبائل تھے جو ہجرت کر کے ترکی، شام اور اردن میں آباد ہو گئے تھے۔ دورِ عباسی ہی سے ان کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ چونکہ یہ عربی النسل نہ تھے، انھیں عربوں کی ریشہ دوانیوں سے ''بظاہر'' کوئی دلچسپی نہ تھی، عباسی خلفا کو اس لیے ان کی وفاداری پر اعتماد تھا۔ چنانچہ، عام طور پر، انھیں خلیفہ کے محافظی دستوں میں بطورِ حاجب ملازم رکھا جاتا تھا۔

ــــ مترجم

میں قاہرہ کی راحتوں اور عذابوں میں ابد تک یوں ہی محوِ خواب رہتا اگر اس سال ایک عورت نے مجھے اپنے راز میں شریک کرنے کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا۔ یہ ایک بے حد پرخطر راز تھا، کیونکہ اس میں نہ صرف میری جان جانے کا امکان تھا، بلکہ میری آخرت برباد ہونے کا بھی۔

وہ دن، جب میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی، بڑے بھیانک طریقے پر شروع ہوا تھا۔ نئے شہر میں داخل ہونے سے ذرا پہلے وہ لڑکا جو میرے گدھے کو ہانکنے پر مامور تھا، اس راستے سے بھٹک گیا جسے ہم روز استعمال کیا کرتے تھے۔ اور میں نے بھی اس خیال سے اسے نہیں ٹوکا کہ شاید اس نے ایسا کسی رکاوٹ سے بچنے کے لیے کیا ہو۔ لیکن وہ تو مجھے ایک جم غفیر کے بیچوں بیچ لے آیا، گدھے کی لگام میرے ہاتھوں میں تھما دی، اعتذاراً کچھ بڑبڑایا، اور اس سے قبل کہ میں اس سے پوچھوں تاچھوں، چمپت ہو گیا۔ ایسی حرکت اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ میں نے کھڑے کھڑے فیصلہ کر ڈالا کہ اس حرکت کا اس کے مالک سے ضرور تذکرہ کروں گا۔

اس گہما گہمی کی وجہ بھی جلد سمجھ میں آ گئی۔ سلیبہ نامی سڑک سے سپاہیوں کا ایک دستہ گزر رہا تھا۔ آگے آگے مشعل بردار تھے اور کچھ لوگ تاشے بجاتے چلے آ رہے تھے۔ عین وسط میں کمر تک ننگ دھڑنگ ایک شخص ہاتھ پھیلائے لڑھکتا پڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک رسی سے بندھا ہوا تھا جسے ایک گھڑ سوار کھینچ رہا تھا۔ منادی ہو رہی تھی کہ اس شخص کو، جس پر رات کے اندھیرے میں عمامے چرانے کا الزام تھا، بیچ سے دولخت کرنے کی سزا دی گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی سزا عام طور پر محض قاتلوں ہی کے لیے وقف تھی، لیکن گزشتہ چند دنوں سے چوری کی وارداتوں میں اس شدت سے اضافہ ہوا تھا کہ مقامی تجار مثالی سزا کا پر زور مطالبہ کر رہے تھے۔

ناگہانی دو سپاہی اس بدبخت پر جھپٹے اور اپنے کو اس پر گرا دیا۔ آدمی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ تاہم وہ اس طرز عمل پر چیخا چلایا ہرگز نہیں، بس ایک افسردہ سی آہ بھری اور بیچارگی سے سر ہلا دیا۔ وہ ابھی زمین پر ٹھیک سے چت بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک سپاہی نے اسے بغلوں سے گرفت میں لے لیا، اور ٹھیک اسی وقت ایک دوسرے نے پاؤں سے۔ جلاد دونوں ہاتھوں سے ایک بڑی بھاری تلوار اٹھائے آگے بڑھا اور کمر پر ایک ہی وار سے مجرم کے جسم کو دولخت کر دیا۔ میں نے فوراً نظریں پھیر لیں۔ پیٹ میں اس زور کا تشنج محسوس ہوا کہ میرا سکتہ زدہ جسم تقریباً زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اچانک ایک مددگار ہاتھ میری اعانت کے لیے بلند ہوا اور ایک پیر مرد کی آواز سنائی دی:

''سواری پر چڑھے چڑھے موت کا نظارہ نہیں کرنا چاہیے۔''

میں بری طرح بوکھلا گیا۔ لیکن زمین پر کود پڑنے کے بجائے، جس کی طاقت مجھ میں نہ تھی، میں

اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ گدھے کی پشت سے چمٹ گیا۔ پھر میں نے گدھے کو پلٹایا اور واپس ہولیا۔ اس پر اُن لوگوں نے احتجاج کیا جو میرے اس اچانک داؤ پیچ کے باعث تماشے کا اگلا حصہ دیکھنے سے محروم ہو گئے تھے، یہی کہ کس طرح مجرم کا اوپری دھڑ کچے چونے کے ڈھیر پر اژدحام کے رخ رکھا گیا، جہاں وہ چند منٹ تک تڑپنے کے بعد ساکن ہو گیا۔

اس واردات سے گریز کی خاطر میں نے اپنے مشاغل کی طرف متوجہ ہونے کا فیصلہ کیا ـــــ اور وہ یہی تھے کہ جا کر قافلوں کی آمد و رفت کا پتا لگاؤں، اِدھر اُدھر کی غپ شپ سنوں۔ لیکن میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا، سر مسلسل بھاری ہوتا گیا۔ معلوم ہوتا تھا گویا میں دورانِ سر سے بتدریج مغلوب ہوتا جا رہا ہوں۔ الغرض، جہاں تہاں پھرتا پھرا۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک پر، ایک بازار سے دوسرے بازار میں، نیم باہوش۔ زعفران اور تلے جاتے پنیر کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکراتی رہی، اور دور سے ان خوانچہ فروشوں کا شور کانوں میں آتا رہا جو مجھے مخاطب کر رہے تھے۔ خدمت گارلڑکے سے آزاد، کہ وہ ہنوز اس ہولناک منظر کے تماشے میں گم تھا، میرا گدھا اپنی عادت اور موڈ کے مطابق گھومتا پھرا۔ یہ صورت حال جاری رہی تا آنکہ ایک تاجر کی نظر مجھ پر آ پڑی۔ مجھے دگرگوں پا کر وہ آگے بڑھا اور گدھے کی باگ خود سنبھال لی، پھر یاسمین میں بسے شکر کے پانی کا ایک پیالہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اسے پیتے ہی میرے تشنج میں قدرے افاقہ ہوا۔ میں خان الخلیلی میں تھا، اور میرا محسن ـــــ اکبر نامی کوئی شخص، جس پر خدا اپنے نعائم اور اکرام کی بارش کرے ـــــ یہاں کے متمول ترین ایرانی تاجروں میں سے تھا۔ اس نے مجھے وہاں بٹھائے رکھنے پر اصرار کیا اور حلفیہ کہا کہ جب تک میری حالت میں پوری طرح افاقہ نہیں ہو جاتا، وہ مجھے یہاں سے اٹھنے نہیں دے گا۔

مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ بھر ہو گیا۔ میرا سر دھیرے دھیرے اس کہر زدہ کیفیت سے باہر آ رہا تھا۔ اتنے میں وہ جرکسی عورت وہاں داخل ہوئی۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ اس کی کس چیز نے سب سے پہلے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا: اس کا چہرہ، غایت درجے کا حسین، لیکن اتنا ہی بے پردہ؛ بس ایک مہین سی سیاہ دوپٹی نے اس کی سنہری لٹوں کو بکھرنے سے بچائے رکھا تھا؛ یا یہ اس کی کمر تھی جو، اس شہر کے ڈھرے کے برخلاف جہاں صرف فربہ اندام عورتوں ہی کی پذیرائی ہوتی تھی، بے حد پتلی تھی، یا یہ نہیں تو پھر شاید یہ اکبر کا وہ مبہم انداز تھا، مودبانہ، لیکن ضرورت سے زیادہ پُر جوش بھی نہیں جس سے اس

نے اسے مخاطب کیا تھا: ''ہائی نس!''

اس کا لاؤلشکر بھی اتنا مختصر تھا کہ اسے متوسط گھرانے کی معمولی خاتون سے بالا تصور کرنا محال تھا۔ پیچھے، خادمہ کے طور پر، لے دے کر، بس ایک دیہاتی عورت چلی آ رہی تھی جس کے حرکات و سکنات بے لوچ تھے اور انداز میں ہمہ وقت مخل رہنے کی کیفیت نمایاں تھی۔ یہ ایک بوسیدہ سے گھسے پٹے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے اٹھائے ہوئے تھی۔ میں جرکسی خاتون کو یقیناً بے محابا گھور رہا ہوں گا، جبھی تو اس نے یکلخت بڑی جالبِ توجہ حرکت کے ساتھ اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ یہ دیکھ کر اکبر نے بڑے راز دارنہ، لیکن اتنے ہی دانستہ اور با تکلف، لہجے میں مجھ سے کہا:

''ہر رائل ہائی نس، شہزادی نور، ترکِ معظم کے بھتیجے امیر علاء الدین کی بیوہ۔''

میں نے بادلِ ناخواستہ نظریں دوسری طرف کر لیں لیکن میرا تجسس اپنے اوج پر تھا۔ اس علاء الدین کی رام کہانی سے قاہرہ کا ہر کس و ناکس واقف تھا۔ اُس برادر کشانہ خانہ جنگی میں جس نے سلطان بایزید کے ورثا کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا تھا، اس علاء الدین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ایک موقعے پر تو یہ گمان بھی ہونے لگا تھا کہ وہ واقعی غالب آ گیا ہے، اور یہ اس وقت جب وہ شہر بُرسا پر قبضہ آور ہوا تھا اور قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ انجام کار غلبہ اس کے چچا سلیم ہی کا ہوا۔ یہ نیا عثمانی سلطان غایت درجے کا جابر نکلا۔ اپنے بھائیوں کو گلا گھنٹوا کر موت کے گھات اتارا، اور ان کے اہل و عیال کو بھی چن چن کر ہلاک کروا دیا۔ تاہم علاء الدین کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا اور قاہرہ میں جا کر پناہ لی۔ یہاں اُسے بڑے احترام اور احتشام کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک محل اور متعدد ملازم اس کے حوالے کر دیے گئے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ان دنوں علاء الدین سلطنتِ مملوک، ایران کے شاہنشاہ، نیز اناطولیہ کے عین قلب میں آباد مختلف جنگجو ترکی قبائل کی مدد سے اپنے چچا کے خلاف بغاوت کو ہوا دینے میں ہمہ تن مصروف تھا۔

کیا یہ اتحاد سلیم قوی کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوتا؟ یہ کبھی نہ معلوم ہو سکے گا، کیونکہ قاہرہ آمد کے چار ماہ بعد علاء الدین طاعون کی وبا میں کھیت رہا۔ اس وقت اس کی عمر بہ مشکل پچیس سال ہوگی، اور ابھی حال ہی میں اس نے ایک بے حد حسین جرکسی عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر اس سے شادی رچائی تھی۔ یہ عورت علاء الدین کی حفاظت پر مامور دستے کے افسر کی بیٹی تھی۔ قاہرہ کے سلطان نے، جو شہزادے کی

موت پر بظاہر بہت مغموم ہوا تھا، بنفسِ نفیس اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ تجہیز و تکفین بڑے پرشکوہ طریقے پر ہوئی، اور سب سے زیادہ قابل لحاظ بات تو یہ ہے کہ ان کی ادائیگی خالص عثمانی رسم کے مطابق ہوئی، جو قاہرہ میں بالکل غیر مانوس تھی۔ علاء الدین کے اسپ آگے آگے، دُم بریدہ، زین الٹی ہوئی؛ تابوت پر جسم کے عین اوپر اس کا عمامہ اور کمانیں، جنھیں توڑ دیا گیا تھا۔

تاہم والیِ قاہرہ نے، دو ماہ بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ علاؤ الدین کو دیا ہوا محل واپس لے لیا۔ اس حرکت پر عوام نے اسے کافی سب وشتم بھی کیا۔ عثمانی شہزادے کی بیوہ کو اس کے عوض ایک معمولی سی رہائش گاہ دے دی گئی اور اس کے نام اتنا حقیر وظیفہ جاری کر دیا گیا کہ وہ اپنے شوہر کی چھوڑی ہوئی دو ایک نوادرات کو نیلام کرنے پر مجبور ہو گئی۔

یہ ساری باتیں اُنھیں دنوں میرے علم میں آئی تھیں۔ میں نے انھیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ میں ان تفصیلات کو ابھی دل ہی دل میں دہرا رہا تھا کہ اچانک نور کی دلدوز لیکن باوقار آواز میرے کان کے پردے سے ٹکرائی:

''شاہ اپنے محل میں بیٹھا بڑے عالی شان منصوبے بناتا رہتا ہے، اس سے بے خبر کہ ٹھیک اُسی لمحے، کسی جھونپڑے میں، کسی دست کار کی انگلیوں نے اس کا کفن بُننا شروع کر دیا ہوتا ہے۔''

اس نے یہ الفاظ عربی میں ادا کیے تھے، لیکن اس مخصوص جرکسی لہجے میں جسے پہچاننے میں قاہرہ کا کوئی شہری غلطی نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ یہ لہجہ بلاشبہ سلطان اور مملوک عہدے داروں کا تھا۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی تاجر قیمت لگا کر لے آیا:

''پچھتر دینار۔''

وہ یک دم زرد پڑ گئی۔

''پوری دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملنے کی۔''

یہ دیوار پر آویزاں کی جانے والی بے حد ماہرانہ کڑھائی کے کام کی ٹیپسٹری تھی جس کے چاروں طرف کندہ کاری کا چوبی فریم چڑھا ہوا تھا۔ ٹیپسٹری میں بھیڑیوں کے ایک غول کی منظرکشی کی گئی تھی جو کسی برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

اکبر نے مجھے تصدیق کرنے کے لیے بلایا۔

''ہائی نس بالکل بجا فرمارہی ہیں، لیکن میری دکان نوادرات سے پہلے ہی اٹی پڑی ہے۔ میں انھیں مندا بیچنے پر مجبور ہوں۔ خریدار عنقا ہو گئے ہیں۔''

شائستگی کے مارے میں نے سر کو خفیف سا آگے جھکا دیا۔ اکبر مطمئن ہو گیا کہ اس نے میرا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ چنانچہ اس نے بات آگے بڑھائی:

''پچھلے تیس سالوں میں جب سے میں نے یہ دھندا شروع کیا ہے، یہ بدترین سال ہے۔ لوگ اس خوف سے کہ ان پر مال دولت چھپا کر رکھنے کا الزام نہ دھرا جائے اور نتیجے میں کوئی ہتھیا نے نہ پہنچ جائے، اپنے دیناروں کی ہلکی سی جھلک دکھانے کا بھی یارا نہیں رکھتے۔ پچھلے ہفتے کی بات ہے، محض کسی کی مخبری کی بنیاد پر ایک گانے والی کو گرفتار کر لیا گیا۔ سلطان نے خود اس سے اس معاملے میں جرح کی، دریں اثنا حفاظتی دستے کے سپاہی مسلسل بیچاری کا پاؤں کچلا کیے۔ کھڑے کھڑے پورے ڈیڑھ سو طلائی سکے نکلوا لیے۔''

اکبر نے کلام جاری رکھا:

''براہِ کرم یہ لحاظ ضرور رہے کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ ہمارے سلطان نے، خدا انھیں اپنے امن وامان میں رکھے، یہ طرزِ عمل مجبوراً اختیار کیا ہے۔ بندرگاہوں سے محصول چنگی کی آمد بالکل بند ہے۔ ایک سال ہوا چاہتا ہے کہ پرتگال کے بحری قزاقوں کے خوف سے بندرگاہ پر ایک جہاز بھی نہیں آنے پایا ہے۔ دمیاط کی حالت بھی بہت اچھی نہیں۔ رہی اسکندریہ کی بندرگاہ، تو بیوپار کی کمی کے باعث اطالوی تجار اسے کب کا تج کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا یہ وہی شہر ہے جہاں کل تک چھ لاکھ متنفس آباد تھے، جہاں بارہ ہزار بقالوں اور پنساریوں کی دکانیں رات گئے تک کھلی رہتی تھیں، اور چالیس ہزار یہودی شرعی جزیہ ادا کیا کرتے تھے! سچ تو یہ ہے کہ آج اسکندریہ سرکاری خزانے کو اس سے کم سرمایہ فراہم کرتا ہے جو خود خزانے کو اسکندریہ کے بندوبست پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے نتائج بھی روز ہی سامنے آتے رہتے ہیں۔ سپاہ کو سات ماہ سے کھانے میں گوشت نہیں ملا ہے؛ فوج اُبال کی کیفیت میں ہے؛ اور سلطان ہر اس جگہ جہاں ملنے کا امکان ہو، پیسہ ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں۔''

ایک آدمی کے آمد سے اکبر کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نووارد کو خالی ہاتھ پا کر اکبر نے سوچا ہوگا

کہ شاید کوئی گاہک ہے۔ چنانچہ اس نے ہم سے تھوڑی دیر کے لیے اجازت چاہی۔ شہزادی نے روانگی کے لیے پر تولے، لیکن میں نے باز رکھتے ہوئے کہا:

''آپ کو اس کے عوض کتنے مل جانے کی توقع تھی؟''

''پورے تین سو دینار۔ اس سے پائی کم نہیں۔''

میں نے ٹیپسٹری کو دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں اسے خریدنے کا تہیہ کر چکا تھا، تاہم بغیر دیکھے بھالے لینا بھی نہیں چاہتا تھا، مبادا وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ محض رحم کھا کر خرید رہا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ضرورت سے زیادہ چھاننا پھٹکنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس میں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آنے کا خطرہ تھا۔ میں نے ٹیپسٹری پر سرسری نظر دوڑائی اور بے رنگ لہجے میں کہا:

''تین سو بالکل معقول قیمت ہے۔ مجھے دے دیجیے۔''

لیکن وہ صاف پہچان گئی۔ بولی:

''عورت ایسے آدمی سے تحفہ قبول نہیں کرتی جس سے اظہارِ تشکر بھی نہ کر سکے۔''

الفاظ میں قطعیت تھی، گو لہجہ اتنا قطعی نہ تھا۔ میں نے بناوٹی برہمی سے جواب دیا:

''یہ کوئی تحفہ وحفہ نہیں۔ میں اسے خرید رہا ہوں تو اس لیے کہ مجھے پسند ہے۔''

''وہ بھلا کیوں؟''

''یہ ایک نشانی ہے۔''

''مگر آپ نے تو اسے پہلی بار ہی دیکھا ہے؟''

''بعض اوقات کسی شے کے بے بدل ہونے کا اندازہ کرنے کے لیے بس ایک نگاہ ہی کافی ہوتی ہے۔''

وہ ایک دم سرخ ہو گئی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں، ہمارے ہونٹ جدا ہوئے، ہم دوست بن چکے تھے۔ ملازمہ، پہلے سے کہیں زیادہ بشاش، ہمارے درمیان در آئی اور ہماری سرگوشیوں کو سننے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم نے ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا: جمعے کے دن، ظہر کے وقت، ازبکیہ چوک میں، گدھے کا تماشا دکھانے والے کے مقابل۔

❀❀❀

میں جب سے مصر میں وارد ہوا تھا کبھی جمعے کی نماز ناغہ نہیں کی تھی۔ لیکن اس دن کردی، اور کمال یہ کہ ناغہ کرنے پر پچھتاوے کا ادنیٰ ترین احساس بھی نہیں ہوا۔ اس میں میرا کیا قصور: یہ خالقِ حقیقی ہی تھا جس نے اسے اتنا دلنواز بنایا تھا، اور یہ وہی تھا جس نے میری اس سے مڈبھیڑ کرائی تھی۔

مساجد بتدریج خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ ازبکیہ چوک آہستہ آہستہ لوگوں سے بھرتا جا رہا تھا، کیونکہ اہالیانِ قاہرہ کا معمول تھا کہ وہ جمعے کی نماز کے بعد پاسا کھیلنے، قصہ گویوں کی تقریر بازی سے محظوظ ہونے، یا آس پاس کے گلیاروں میں، جہاں بعضے بعضے مے خانے اسی زمین پر باغِ عدن کی رنگ رلیوں کا مزہ کروا دیتے ہیں، خود کو کھو دینے کے لیے جمع ہوتے تھے۔

مجھے اپنی جز کسی معشوقہ ابھی نظر نہیں آئی تھی، لیکن گدھے کا کرتب دکھانے والا وہاں موجود تھا۔ اس کے اردگرد شہر کے نکموں کا اچھا بھلا مجمع لگ چکا تھا۔ میں بھی اس میں جا شامل ہوا۔ رہ رہ کر ایک نظر اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے چہروں پر ڈال لیتا، اور اس امید میں سورج پر بھی کہ اس اثنا میں وہ چند درجے اور آگے بڑھ گیا ہوگا۔

مسخرہ اپنے گدھے کے ساتھ ناچنے لگا تھا اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ناچ میں وہ گدھے کی پیروی کر رہا ہے یا گدھا اس کی۔ اب اس نے گدھے سے باقاعدہ گفتگو بھی شروع کر دی تھی۔ اس نے گدھے کو بتایا کہ سلطانِ وقت نے ایک بہت بڑے تعمیری منصوبے کا ڈول ڈالا ہے: چنانچہ قاہرہ کے جملہ گدھے چونا پتھر ڈھونے کے واسطے بیگار میں لیے جانے والے ہیں۔ بس جناب، یہ سننا تھا کہ گدھا دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہو گیا، پھر پشت کے بل ہو کر دولتیاں ہوا میں اٹھا دیں، پیٹ پھلا لیا اور زور سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کا مالک تماشا دیکھنے والوں کے سامنے زور زور سے بین کرنے لگا کہ میرا گدھا مر گیا ہے، اور نیا گدھا خریدنے کے واسطے چندہ وصول کرنے لگا۔ جب کئی درجن سکے جمع کر لیے تو گدھے کی طرف اشارہ کر کے بولا:

"یہ خیال بھول کر بھی نہ فرمایئے گا کہ موصوف اس دیارِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ حضرت سخت پیٹو واقع ہوئے ہیں، اور چونکہ میری غربت سے کماحقہٗ آگاہ ہیں اس لیے مرنے کا ڈھونگ رچایا ہے،

تا کہ میں کچھ کما لوں اور اس سے ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر سکوں۔"

اس نے ایک موٹی سی لکڑی اٹھائی اور دبادب گدھے کی مزاج پرسی کر دی:

"چل اٹھ، اب اٹھ بھی چک!"

گدھے نے بھولے کو بھی حرکت نہ کی۔ مسخرے نے کلام جاری رکھا:

"اہالیانِ قاہرہ! سلطان نے ابھی ابھی فرمان جاری کیا ہے کہ ساری آبادی کل باہر آ کر اس کے شہر میں فتح مند داخل ہونے کا نظارہ کرے۔ اعلیٰ طبقے کی خواتین کی سواری کے واسطے شہر بھر کے گدھوں کو بیگار میں لے لیا گیا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ گدھے نے جست بھری اور پھٹ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کو سنوارنے لگا اور بڑی شدید مسرت کا اظہار کرنے لگا۔ اس پر اس کا مالک اور سارے تماش بین قہقہہ زن ہو گئے۔

"اوہ ہو!" اس نے گدھے سے کہا، "تو تمھیں خوب صورت عورتیں پسند ہیں! لیکن یہاں تو جانے ایسی کتنی عورتیں موجود ہیں۔ بتاؤ تم کس کے واسطے سواری بنو گے؟"

گدھا تماش بینوں کا پھیرا لگانے لگا، تھوڑا سا متذبذب ہوا، اور پھر سیدھا ایک طویل قامت خاتون کی طرف بڑھا جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اتنی دبیز نقاب چڑھا رکھی تھی کہ اس کے پیچھے اس کا پورا چہرہ اوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم میں اس کا رکھ رکھاؤ فوراً پہچان گیا۔ اٹھتے قہقہوں کے طوفان اور نظروں کی یورش سے ہراساں ہو کر وہ خود میری طرف چلی آئی اور مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے مزاحیہ انداز میں گدھے سے کہا: "نہیں بھئی، تم میری بیوی کے لیے سواری مہیا نہیں کرو گے!" اور نہایت باوقار انداز میں عورت کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

"ہیں یہ کیا؟ مجھے ذرا توقع نہیں تھی کہ تم نقاب ڈاٹ کر آؤ گی۔ خیریت ہوئی کہ گدھا موجود تھا، ورنہ میں تو تمھیں پہچان ہی نہ پاتا۔"

"اسی لیے تو نقاب چڑھا رکھی ہے کہ پہچانی نہ جا سکوں۔ ہم سڑک پر متجسس اور افواہ پسند مجمعے کے بیچوں بیچ ہیں، تاہم کسی متنفس کو یہ گمان نہیں ہو رہا کہ میں تمھاری بیوی نہیں۔"

پھر اس نے شرارت سے سر ہلا کر کہا:

"جب مقصد تمام مردوں کو خوش کرنا ہو تو نقاب اتار دیتی ہوں؛ لیکن جب صرف ایک ہی مرد کی

مسرت منظور ہو تو نقاب چڑھا لیتی ہوں۔"

"یہ بات ہے تو آج سے مجھے تمھارا بے نقاب نکلنا سخت ناپسند ہوگا۔"

"تو کیا تم مجھے کبھی دیکھنا نہیں چاہتے؟"

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میں اسے بھلا کہاں بے نقاب دیکھ سکتا تھا۔ ہم کسی مکان میں، خواہ اس کا، خواہ میرا، کبھی اکیلے میں نہیں مل سکتے تھے، اور شہر میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلنے ہی پر ہمیں اکتفا کرنی پڑتی تھی۔ ہماری اولین ملاقات کے دن ہی نور نے باغِ ممنوعہ جانے پر اصرار کیا۔

"یہ نام اسے اس لیے دیا گیا ہے،" نور نے وضاحت کی، "کہ اس کے اردگرد ایک اونچی دیوار کھنچی ہوئی ہے، اور سلطان نے اس میں داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے، تاکہ فطرت کے اس عجوبے کی حفاظت ہو سکے؛ دنیا کا وہ واحد درخت جس سے خالص بلسان پیدا ہوتا ہے۔"

دربان کے ہاتھ پر ایک چاندی کا سکہ رکھنے کی دیر تھی کہ اس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ بلسان کے درخت پر جھکتے ہوئے نور نے یکلخت اپنی نقاب الٹ دی اور ایک طویل وقفے تک بے حس و حرکت کھڑی رہی، سحر زدہ سی، یوں جیسے خواب میں ہو۔ پھر اس نے دہرایا، بظاہر اپنے آپ سے:

"پوری دنیا میں بس یہی ایک جڑ ہے، اتنی سڈول، اتنی نازک، پھر بھی اتنی بیش قیمت!"

میں نے درخت کو خوب غور سے دیکھا، تاہم مجھے اس میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ اس کی پتیاں انگور کی پتیوں سے مشابہہ تھیں، بس ذرا چھوٹی رہی ہوں گی۔ اور یہ ایک چشمے کے بیچوں بیچ اگا ہوا تھا۔

"کہتے ہیں کہ اگر کسی اور پانی سے اس کی آبیاری کی جائے تو یہ فوراً خشک ہو جائے۔"

وہ اس سیر سے کافی متاثر ہوئی تھی، گو اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ اگلے دن ہم پھر باہم ہوئے اور اس مرتبہ بھی وہ کافی مسرور اور ملتفت نظر آئی۔ اب ہم ہر روز سیر کو جانے لگے تھے، یا تقریباً ہر روز، کیونکہ پیر اور منگل کو وہ کبھی خالی نہ ہوتی۔ کوئی ایک ماہ گزر جانے کے بعد میں نے جب ہلکے سے شکایت آمیز لہجے میں اس کا ذکر کیا تو اس کا ردِعمل خاصا تند تھا:

"اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تمھیں سرے سے میری ملاقات ہی میسر نہ ہوتی، یا ہوتی بھی تو مہینے میں

ایک آدھ بار۔ میں ہفتے میں دو، تین، بلکہ پورے پانچ دن تم سے ملتی ہوں، اور تم الٹے میری عدم موجودگی کا شکوہ کرنے بیٹھ گئے ہو۔''

''بات یہ ہے کہ میں تم سے ملاقات والے دن شمار نہیں کرتا۔ یہ دوسرے دن ہیں جو غیر مختتم معلوم ہوتے ہیں۔''

وہ اتوار کا دن تھا۔ ہم ابن طولون کی مسجد کے پاس عورتوں کے حمام کے سامنے تھے، جس میں نور بس اب داخل ہوا چاہتی تھی۔ لیکن پھر وہ کچھ جھجکتی نظر آئی:

''کیا تم میرے ساتھ کہیں چل سکتے ہو؟ لیکن شرط ہے کہ ادنیٰ سا استفسار بھی نہیں کرو گے۔''

''تمھارے ساتھ تو میں چین تک بھی جانے کو تیار ہوں۔''

''اچھا تو پھر کل جیزہ کی مسجد کے سامنے دو اونٹوں اور پانی سے لبریز مشکیزوں کے ساتھ تیار ملو۔''

***

میں اپنا قول دے چکا تھا، اس لیے منزل کے متعلق پوچھ گچھ پر میں نے اصرار نہیں کیا۔ ہمیں اونٹوں پر چلتے چلتے کوئی دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس مدت میں ہم نے ایک دوسرے سے بمشکل ڈیڑھ دو لفظ ہی کہے ہوں گے۔ تاہم میں نے سوچا کہ صرف اتنا کہنا اقرار نامے کی روح کے منافی تو کیا ہوگا:

''اہرام یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔''

''بالکل۔''

میں نے کلام جاری رکھا:

''ہم وہیں جا رہے ہیں نا؟''

''بالکل۔''

''تم ہر ہفتے یہاں ان مدوّر عمارتوں کی سیر کے لیے آتی ہو۔ آتی ہو نا؟''

اس پر اس نے ایک بے لاگ اور غارت گر قہقہہ لگایا، جس سے میری بڑی دل شکنی ہوئی۔ اپنی آزردگی کے مظاہرے کے لیے میں اپنے اونٹ سے نیچے اتر آیا، اور اس کی دونوں ٹانگیں ملا کر باندھ

دیں۔ وہ بے چین عجلت سے میری طرف لوٹی:

"مجھے افسوس ہے کہ ہنسی آ گئی۔ کرتی بھی کیا؟ تم نے کہا کہ وہ مدوّر ہیں۔"

"یہ میں نے خود نہیں گھڑ لیا۔ ابن بطوطہ نے، جو بڑا نامی گرامی سیاح ہے، بالکل یہی کہا ہے کہ مدور ہیں۔"

"اس لیے کہ اس نے بچشم خود دیکھنے کے زحمت گوارا نہیں کی۔ یا ممکن ہے اگر دیکھا ہو تو بہت دور سے، یا رات کے وقت۔ الغرض، خدا اس کی مغفرت کرے، اسے قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں۔ جب کوئی سیاح اپنے کارناموں کا ذکر لے بیٹھتا ہے تو، لامحالہ، اپنے سامعین کے ستائشی تبسم کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اپنی ہیٹی کے خیال سے اس میں یہ کہنے کا یارا نہیں رہتا کہ مجھے معلوم نہیں یا میں نے بچشم خود نہیں دیکھا۔ ایسے جھوٹ بھی ہیں جن کو پھیلانے کے مرتکب زبان سے زیادہ کان ہوتے ہیں۔"

اب ہم پھر سے چل پڑے تھے۔ نور نے کلام جاری رکھا:

"ہاں تو تمھارے ابن بطوطہ صاحب نے اہرام مصر کے بارے میں اور کیا کیا کہا ہے؟"

"یہی کہ انھیں ایک ایسے حکیم دانا نے تعمیر کرایا تھا جو علم نجوم سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے آنے والے سیلاب کی پیش بینی زمانوں پہلے کر لی تھی، اسی لیے اس نے یہ اہرام تعمیر کرائے تھے اور ان پر جملہ علوم وفنون کی تصویر کشی کر دی تھی، تاکہ انھیں فراموشی اور تباہی سے بچا سکے۔"

مزید طنز کے خوف سے میں نے جلدی سے یہ اضافہ بھی کر دیا:

"اور ابن بطوطہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ محض خیالی باتیں ہیں؛ کسی کو وثوق سے معلوم نہیں کہ ان عجیب وغریب عمارتوں کی تعمیر کا اصل مقصد کیا ہے۔"

"میرے لیے تو اہرام مصر اس لیے بنے ہیں کہ دل نواز ہوں، پرشکوہ ہوں، اور دنیا کے اولین عجائب! ظاہر ہے ان کی تعمیر کے پیچھے کوئی نہ کوئی عملی مقصد بھی رہا ہوگا لیکن اسے شہزادۂ وقت کے لیے ایک بہانے سے زیادہ نہ سمجھنا چاہیے۔"

اس وقت ہم ایک ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ رہے تھے۔ سامنے، افق پر، اہرام بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ نور نے اپنے اونٹ کو لگام دے کر روکا، اور مشرق کی طرف ہاتھ دراز کیا۔ جذبے کی فراوانی نے اس کے انداز میں ایک دل آویز متانت پیدا کر دی تھی۔

"ہمارے گھر، ہمارے محل، حتیٰ کہ ہم خود فنا ہو جائیں گے، لیکن اس کے مدتوں بعد تک یہ اہرام یہیں باقی رہیں گے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں، خدائے لازوال کی نظر میں، کہ یہ غایت درجے کے کارآمد ہیں؟"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"فی الوقت تو ہم زندہ ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ، اور ہمیں تنہائی بھی میسر ہے۔"

اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی، پھر اچانک بڑے شرارتی لہجے میں بولی:

ہاں، یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمیں تنہائی میسر ہے!"

اس نے اپنے اونٹ کو میرے اونٹ سے بھڑا کر کھڑا کر دیا، پھر نقاب اٹھائی اور مجھے ہونٹوں پر چوما۔ خدایا، میں یوم الحساب تک یوں ہی کھڑا رہتا!

یہ میں نہ تھا جو اس کے ہونٹوں سے جدا ہوا؛ یہ وہ نہ تھی جس نے عمداً خود کو مجھ سے علیحدہ کیا۔ یہ قصور تو سراسر ہمارے اونٹوں کا تھا جو ذرا جلدی ہی ایک دوسرے سے گریزاں ہو گئے، ساتھ ہی ہمیں بھی لڑکھڑا دیا۔

"دیر ہو رہی ہے، کیوں نہ تھوڑا سا آرام کر لیں؟"

"اہراموں پر؟"

"نہیں، ان سے ذرا آگے۔ یہاں سے بس چند ہی میل دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں میری ماما رہتی ہے۔ اس نے بچپن سے میری پرورش کی ہے۔ وہ ہر پیر کی شام میرا انتظار کرتی ہے۔"

گاؤں سے ہٹ کر ایک طرف قدرے اٹھے ہوئے راستے کی انتہا پر گارے سے لپا پتا ایک چھوٹا سا دہقانی گھر تھا۔ نور اس راستے پر ہولی۔ جاتے جاتے مجھ سے عاجزی کر گئی کہ خدارا اس کے پیچھے پیچھے نہ آؤں۔ وہ اس گھر میں داخل ہوئی۔ میں ایک کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ لوٹی تو اس وقت تک کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ لیکن ہٹی کٹی اور سہل انگار دہقان عورت چلی آ رہی تھی۔

"خضرہ، یہ میرے شوہر ہیں۔"

میں مارے حیرت کے اچھل پڑا۔ میری گھورتی آنکھوں کو نور کے چہرے پر ایک شکن ابھرتی نظر

آئی۔ دوسری طرف وہ بڑھیا خدا سے محوِ گزارش تھی:

''اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی! میری دعا ہے کہ اس بار میری شہزادی کی قسمت بہتر ثابت ہو!''

''اور میری بھی یہی دعا ہے!'' میں برجستگی سے چلا دیا۔

نور مسکرادی۔ خضرہ نے بڑبڑا کر کوئی التجائی دعا پڑھی، اور فوراً بعد اپنی قیادت میں ہمیں اپنے گھر سے قریب ایک کچی عمارت کی طرف لے آئی، جو کچھ اور زیادہ شکستہ اور بدحال تھی۔

''تم جانو یہ کوئی محل وحل تو نہیں، البتہ تم دونوں یہاں بھیگنے کے نہیں، اور تمھاری تنہائی میں کوئی مخل بھی نہ ہوگا۔ میری ضرورت پڑے تو کھڑکی کھول کر آواز دے لینا۔''

بس ایک مستطیل کمرہ تھا جس میں ٹمٹماتی ہوئی موم بتی جل رہی تھی۔ لوبان کی دبی دبی سی خوشبو ہمارے چاروں طرف تیر رہی تھی، کھلی کھڑکی سے باہر بھینسوں کے ڈکارنے کی آواز آرہی تھی۔ میری جرکسی محبوبہ نے کواڑ کی زنجیر چڑھائی اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

پہلے اس کی الجھی زلفیں کھل کر گریں، اور پھر اس کا لباس۔ اس کی ننگی گردن کے گرد یاقوت کا ہار پڑا ہوا تھا، جس کا وسطی لعل بڑے فخر سے اس کی چھاتیوں کے بیچ جھول رہا تھا۔ اور اس کی عریاں کمر سے طلائی تارکشی کا پتلا سا پٹکا حمائل تھا۔ میں نے آج تک کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی جو اپنی برہنگی میں اس درجہ غنی ہو۔ وہ بڑھ کر میرے پاس آئی اور سرگوشی میں کہا:

''میری جگہ دوسری عورتیں ہوتیں تو سب سے پہلے اپنے مانوس اور شخصی زیور بیچ دیتیں، لیکن میں نے انھیں بچائے رکھا۔ گھر اور اس کی آرائش اور اس کا ساز و سامان بیچا جاسکتا ہے، جسم نہیں، نہ ہی اس کی زینت۔''

میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگالیا:

''صبح سے اب تک میں ایک کے بعد ایک اچنبھے پر قناعت کرتا رہا ہوں: پہلے اہرامِ مصر، پھر تمھارا بوسہ، ہماری شادی کا اعلان؛ اور اب یہ کمرہ، یہ رات، تمھاری آرائش، تمھارا جسم، تمھارے لب...''

میں نے بڑی شہوت سے اسے چوما، جس کے باعث وہ اس اعتراف کی ضرورت ہی سے مستغنی

ہوگئی کہ جہاں تک اچنبھوں کا تعلق ہے، تو ان کی بسم اللہ ہی ہوئی ہے؛ پوری دعا تو اب آنے والی ہے۔

لیکن ایسا رات گزرنے کے بعد ہی ہوا، رات جو اپنی لذت میں دیرپا تھی۔ ہم ایک دوسرے کے پہلو میں پڑے ہوئے تھے، اتنے قریب کہ اس کی سرگوشیوں سے میرے لب لرز رہے تھے۔ اس کی ٹانگیں اہرام کی شکل میں اٹھی ہوئی تھیں، جن کی چوٹی اس کے آپس میں بھنچے ہوئے گھٹنے تھے۔ میں نے انھیں ہولے سے چھوا اور وہ یوں علیحدہ ہو گئے جیسے ابھی ابھی مسلسل ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے ہوں۔

میری جرکسی! آج بھی میرے ہاتھ کبھی کبھی اس کے جسم کے خط و خال تراشتے ہیں، اور میرے لب کچھ بھی نہیں بھولے۔

❋❋❋

جب میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ نور دروازے سے اسی طرح ٹیک لگائے کھڑی ہے جس طرح آغازِ شب کے وقت تھی، لیکن اس کے بازو بوجھل تھے اور آنکھوں میں ایک جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

"اور یہ رہا میرا بیٹا، بایزید، جسے میں یوں چھپائے رکھتی ہوں جیسے میری شرم ہو، میرے گناہ کا پھل!"

وہ آگے بڑھی اور بچے کو نذرانے کے طور پر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ جو صبر و قناعت سے وا ہو گئے۔

❋

الیگزانڈر سولژے نیتسن

❄

حتیٰ کہ قبر کے منہ پر بھی

لیلیٰ بعلبکی کی ولادت ۱۹۳۶ء میں لبنان کے ایک تجارت پیشہ شیعہ گھرانے میں ہوئی۔ ابھی کم سن ہی تھیں کہ عام رسم ورواج کے مطابق والدین نے کسی نادیدہ مہربان کے ساتھ شادی طے کردی، لیکن رسم ورواج کے عین خلاف لیلیٰ نے صریح طور پر اس انتخاب کو رد کردیا۔ لیلیٰ نے بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی، گو عارضی طور پر انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا اور اس دوران، ایک صحافتی ایجنسی میں سیکرٹری کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ ۱۹۶۰ء میں چند ماہ کے لیے لیلیٰ کا پیرس میں قیام رہا۔ آخرالامر انھوں نے اپنی پسند سے لبنان کے ایک عیسائی کے ساتھ شادی کرلی۔ تصنیفات: دو ناول ہیں، جن میں پہلا ''انا احیاء'' (میں زندہ ہوں) کافی مشہور ہوا۔ یہ انھوں نے کم عمری میں لکھا تھا لیکن اشاعت کے مراحل سے ۱۹۵۸ء میں گذرا۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۶۰ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک افسانوی انتخاب بھی ہے، جس کا عنوان ''سفینة الحنان الی القمر'' ہے، یہ سن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ لیلیٰ بعلبکی کی تحریر بالعموم اس ٹکراؤ اور الجھن کو پیش کرتی ہے جس کا کسی ایسے معاشرے میں رونما ہونا ناگزیر ہے جو روایت شکنی سے ہوتا ہوا جدید زندگی میں اپنی کایا پلٹ کے دردِزہ میں مبتلا ہو۔ چنانچہ لیلیٰ بعلبکی کی تحریریں ''آزادیِ نسواں''، ''مغربیت''، ''فرد کی آزادی''، اور ''روایت پرست معاشرے کے خلاف احتجاج'' جیسے معاصر مسائل پر ارتکاز کرتی ہیں۔

جب لیلیٰ بعلبکی کی نگارشات منظرِ عام پر عام آئیں تو عوام کا ردِعمل بڑا شدید رہا—شدید ''مثبت'' اور ''منفی'' دونوں ہی معنوں میں۔ جنھوں نے پسند کیا—اور یہ بالعموم معاشرے کے پڑھے لکھے elite تھے— تو کچھ اس جذباتی افراط وتفریط کے ساتھ کہ مصنفہ کو صفِ اول کے مغربی فنکاروں کی صف میں لا کھڑا کیا؛ اور جنھوں نے ناپسند کیا، تو وہ کچھ اس شدومد کے ساتھ کہ اس کا کریہہ ترین رُخ وہ مقدمہ تھا جو افسانوی انتخاب 'سفینة الحنان الی القمر'' کے خلاف، اس کے منظرِ عام پر آنے کے نو ماہ بعد، خود حکومتِ لبنان نے ''تخریبِ اخلاق'' کی تعزیر میں چلایا۔ ثبوت کے طور پر اس قسم کے جملے انتخاب سے نکال کر پیش کیے گئے: ''اس نے چادر کے نیچے اپنا ہاتھ غرق کردیا۔ میرے ہاتھ کو تھام کر اپنے سینے پر رکھا، پھر اپنے سفر میں وہ پیٹ کے

اردگرد منڈلانے لگا"، یا "اس نے میرے کانوں کو چوما چاٹا، پھر میرے لبوں کو؛ میرے اوپر چکراتا پھرا، پھر خود کو مجھ پر گرا کر سرگوشی میں کہا کہ اسے بڑی لذت محسوس ہو رہی ہے؛ کہ میں شاداب ہوں؛ نرم و گداز اور نہایت خوف زدہ کن بھی؛ اور کہ اس نے بری طرح میری کمی محسوس کی ہے،" وغیرہ۔ مصنفہ نے اپنے دفاع میں کہا کہ اس قسم کے جملے ادب اور اخلاق سے کہیں بھی متعارض نہیں، کہ "میں نے تو صرف وہی حقائق پیش کیے ہیں جن سے ہم سبھی اپنی زندگی میں دوچار ہوتے ہیں۔" آخرالامر، دیگر تاملات کے علاوہ، خاص طور پر اس نکتے کے پیش نظر کہ لبنانی آئین میں اخلاق سے تجاوز اور تعارض کی کوئی قابلِ عمل وضاحت موجود نہیں، اراکینِ جیوری نے مصنفہ کو بری قرار دے دیا۔

یورپی اور عربی صحافتی حلقوں میں یہ بات اکثر دہرائی جاتی رہی ہے کہ لیلیٰ بعلبکی لبنان کی فرانسواز ساگاں (Francoise Sagan) ہے۔ اس سہل پسندی کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ دونوں نے نہایت کم عمری میں اپنا پہلا ناول لکھا، کہ دونوں ناول اپنی نوعیت میں بڑی حد تک خودسوانحی ہیں، اور یہ کہ دونوں نے اپنے بے لاگ اور بے باک اسلوب سے عوام کو چونکایا۔ مابعد: ساگاں جس فرد کا تصور پیش کرتی ہے وہ خود کو اپنے معاشرے میں تنہا، بے گانہ، اور معاشرے کے افراد جس جوڑتوڑ اور سازباز میں منہمک ہیں اس کے نتیجے میں اکتایا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ساگاں اس معاشرے کا عکس ضرور پیش کرتی ہے، لیکن اس سے گریزاں ہے اور نہ ہراساں، بلکہ ایک حد تک اس کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔ آخرالامر، اس کے کرداروں میں وہ کلبیت (cynicism) ملتی ہے جس کی بدولت وہ خود اپنے جذبات سے بے گانہ نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس لیلیٰ بعلبکی کی تحریر میں اس بے گانگی اور کلبیت کا شائبہ تک نہیں۔ کچھ ہے تو بس احتجاج، اور معاشرے سے اس کی بلاؤں کو دور کر دینے کا ایک براہِ راست کمٹمنٹ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر عام طور پر جذباتی افراط و تفریط کی شکار نظر آتی ہے اور اس کا ناصحانہ عنصر اس کے فنی عنصر کو قدم قدم پر پیچھے دھکیل دیتا ہے۔

ذیل میں جو کہانی پیش کی جا رہی ہے اس کا انگریزی ترجمہ بعنوان A Spaceship of Tenderness to the Moon ہو چکا ہے۔ میں نے عربی سے ترجمہ کرتے وقت اس انگریزی ترجمے کو سامنے رکھا ہے اور اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔

——مترجم

❄

آنکھیں بند کر لینے کے بعد بھی میں اپنے اردگرد ہر چیز کو دیکھ سکتی ہوں: مستطیل صوفہ، جو کمرے کی ایک وسیع دیوار کے سہارے اِس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا ہے، بقیہ دیواروں پر شیلف، چھوٹی سی میز، قالین پر رنگین کشن، سفید لیمپ، جو بڑے سے مٹی کے تیل کے لیمپ سے مشابہہ ہے اور دیوار میں ایک سوراخ سے ٹنگا ہوا، ٹائلوں سے مرصع فرش پر ٹکا ہوا ہے، حتیٰ کہ کھڑکیاں بھی، جو ہم نے بلا پردوں کے چھوڑ رکھی ہیں۔ دوسرے کمرے میں ایک کشادہ صوفہ ہے، آئینے سے مرصع میز، دیوار میں جڑی الماری، اور دو مخملیں کرسیاں۔ شادی کے دن سے اب تک ہم نے اپنے چھوٹے سے گھر میں کسی چیز کو تبدیل نہیں کیا، میں نے کسی بھی چیز کو یہاں سے منتقل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

اپنے شوہر کو یہ بڑبڑاتے سن کر کہ "صبح ہو گئی ہے، اور شہر بھر میں صرف ہم ہی دو جگ رہے ہیں،" میں نے ذرا کی ذرا اپنے پپوٹوں کو کھولا۔ پھر اسے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا، جہاں صبح کی روشنی اس کے پورے چہرے اور اس کے ننگے جسم پر اپنی چاندی بکھیر رہی تھی۔ مجھے اس کے ننگے جسم سے عشق ہے۔

میں نے پھر سے اپنی آنکھیں موند لیں، اپنی دنیا میں لوٹ آئی، جہاں میں اس کے جسم کے ہر ذرے اور ہر مخفی، باریک ترین تفصیل کو دیکھ سکتی تھی: اس کے ملائم بال، پیشانی، ناک، ٹھوڑی، گردن پر تنی ہوئی رگیں، سینے پر پریشان اس کے بال، اس کا پیٹ، اس کے پیر، حتیٰ کہ اس کے ناخن۔ میں نے پکارا کہ وہ لوٹ آئے اور میرے پہلو میں پسر جائے، کہ میں اسے چومنا چاہتی ہوں۔ وہ ساکت رہا۔ مجھ سے یوں الگ ہو کر دور جا کھڑے ہونے کے اس انداز سے میں سمجھ گئی کہ وہ کوئی بہت اہم بات کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ اس طرح وہ بے رحم اور بڑا ہی سرکش نظر آتا ہے: فیصلے کرنے اور پھر انھیں نافذ کرنے پر قادر۔ اور ایک میں تھی، اس کی ضد ـــــ سرتاسر! اس سے جھگڑنے، بحث کرنے کے لیے میرے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ تھامے رہوں، یا اس کے کپڑوں کا لمس محسوس کروں۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں، تکیے کو، جسے میں ہنوز بھینچے ہوئے تھی، دور پھینک دیا، اور اس کی قمیص کو

جھپٹ کر اپنے سینے پر پھیلا لیا۔ پھر میں نے چھت کو گھورتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا اسے سمندر نظر آ رہا ہے۔

''ہاں، نظر آ رہا ہے،'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا کہ کیسے رنگ کا ہے۔

''ایک طرف گہرا نیلا،'' اس نے کہا،'' اور دوسری طرف سفیدی مائل سرمئی۔''

میں نے پوچھا کہ سرو کے درخت کیا اب بھی وہیں ہیں۔

''ہاں بالکل، ان گھروں کے درمیان جو ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں،'' اس نے جواباً کہا۔'' اور عمارتوں کی چھتوں پر پانی پڑا ہوا ہے۔''

میں نے کہا کہ مجھے کھجور کے اس یکہ وتنہا درخت سے والہانہ عشق ہے جو ہمارے یہاں سے دیکھو تو ٹھیک سمندر کے بیچوں بیچ گڑا نظر آتا ہے، اور سرو میرے ذہن میں سفید قبروں کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

وہ خاموش رہا—دیر تک، اور میں چھت کو مسلسل گھورے گئی۔ پھر اس نے کہا،'' مرغ اذان دے رہے ہیں!'' اور میں نے فوراً اسے بتایا کہ پرندوں میں مرغ مجھے ذرا پسند نہیں، کہ یہ فضا میں اڑنے سے قاصر ہیں؛ کہ جب میں بچی تھی تو انھیں گھر کی چھت پر لے جا کر فضا میں چھوڑ دیا کرتی تھی، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید اسی طرح انھیں اڑنا سکھا سکوں، اور خواہ مرغ ہوں یا مرغیاں، یہ سب دھپ سے زمین پر ایک غیر متحرک ڈھیر کی شکل میں جا پڑتے۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا، پھر بولا کہ سامنے والی عمارت کی ایک کھڑکی میں اسے روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے باوجود شہر بھر میں صرف ہم ہی دو بیدار ہیں، صرف ہم ہی دو جنھوں نے تمام رات ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے بسر کی ہے۔ اس نے کہا کہ دیشب اس نے بہت پی لی تھی۔ میں نے یہ کہتے ہوئے جھٹ قطع کلام کیا کہ مجھے'' بہت پی لی تھی'' فقرے سے نفرت ہے، گویا وہ خواہش کی اس جنوں خیزی پر نادم ہے جس کے ساتھ وہ مجھ سے ہم جسم ہوا ہے۔ اس نے فوراً اندازہ کر لیا کہ میں بس اب برہم ہونے ہی والی ہوں، چنانچہ اس نے یکلخت موضوع بدل دیا اور بولا،

''شہر مختلف رنگ اور جسامت کے جگمگاتے قیمتی پتھروں کا ڈھیر لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا اس وقت میرے تخیل میں شہر گتے کے ان رنگین ڈبوں کی مانند لگ رہا ہے جنھیں پھونک مارو تو ڈھیر ہو جائیں، کہ تنہا ہمارا گھر اپنے دو کمروں سمیت بادل سے ننگا فضا میں تیر رہا ہے۔ وہ بولا کہ اس کا منھ خشک ہو رہا ہے اور وہ ایک نارنگی چاہتا ہے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا جملہ ختم کیا کہ اگرچہ اس شہر کے علاوہ میں کسی اور شہر میں نہیں رہی ہوں، پھر بھی مجھے اس سے نفرت ہے، اور اگر میں نے یہ خواب نہ دیکھا ہوتا کہ ایک دن میں ایسے آدمی سے ملوں گی جو مجھے اس شہر سے بہت دور لے جائے گا، تو میں افسردگی کے مارے بہت پہلے ہی مر گئی ہوتی۔ یوں جیسے اس نے میرا آخری جملہ سنا ہی نہ ہو، اس نے دہرایا: ''میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں اور میرا جی ایک نارنگی کھانے کو چاہ رہا ہے۔'' میں نے اس کی خواہش کو نظر انداز کر دیا اور بولے چلی گئی کہ جب وہ ساتھ ہو تو مجھے ذرا پروا نہیں ہوتی کہ کہاں ہوں: زمین اپنے درختوں، پہاڑوں، ندیوں، حیوانوں، اور انسانوں سمیت میرے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔ مزید انتظار کی تاب نہ لا کر وہ مجھ پر استفسار اُچھٹ پڑا: ''تم مسلسل بچے کی پیدائش سے انکار کیے جا رہی ہو— آخر کیوں؟''

میں اداس ہو گئی۔ محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دل پوری شدت سے بھینچ دیا ہو۔ آنسو میری آنکھوں میں بھر آئے، مگر میں نے زبان نہ کھولی۔

''شادی کیے ہمیں کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے ایک لفظ نہ کہا، صرف آنکھوں سے اس کا تعاقب کیے گئی۔ اس نے سرد مہری سے سلسلۂ کلام جاری رکھا: ''شادی کیے ہمیں ایک سال اور چند ماہ ہو چکے ہیں، اور تم ہو کہ مسلسل انکار ہی کیے جا رہی ہو، حالانکہ شادی سے پہلے تمھیں بچوں کا جنون تھا، تم ان کے لیے مری جا رہی تھیں۔''

وہ ڈگمگایا اور صوفے پر ہاتھ مارتے ہوئے برس پڑا: ''اے کرسی! کیا تجھے اس کی التجائیں یاد نہیں؟ اور اے لیمپ! کیا تو نے اس کی گریہ وزاری نہیں سنی تھی؟ اور اے تکیو! کتنی ہی بار کیا اس نے تمھیں ننھے جسموں کا نعم البدل سمجھ کر اپنے سینے سے چمٹائے طویل راتیں نہیں بسر کی تھیں؟ بولو، اے جامد چیزو، جواب دو! اسے اس کی وہ آواز جو تم میں غرق ہو چکی ہے، لوٹا دو!''

میں نے نرمی سے کہا کہ جمادات احساس اور آواز سے عاری ہوتے ہیں۔ ''اور یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ مردہ ہیں؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ اشیا مردہ نہیں ہوتیں، لیکن

یہ لوگ ہی ہیں جو انھیں ان کی دھڑکن عطا کرتے ہیں...اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ فی الوقت وہ اشیا کی بابت بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، کہ میں ہمیشہ اس مسئلے کے حل کی تلاش سے بھاگتی رہی ہوں، لیکن آج وہ مجھے فرار نہیں ہونے دے گا۔ خالی خالی ذہن کے ساتھ میں نے تشریحاً کہا کہ میرے اردگرد چیزیں، بذاتِ خود یہ اشیا — یہ صوفہ، یہ قالین، یہ دیوار، یہ لیمپ، یہ گلدان، یہ شیلف، اور یہ چھت — وہ وسیع آئینہ ہیں جس میں مجھے باہر کی دنیا کا عکس نظر آتا ہے، باہر کی دنیا کا جو مکانوں، سمندر، درختوں، آسمان، سورج، ستاروں، اور بادلوں پر مشتمل ہے۔ اس کی معیت میں میں ان میں اپنا ماضی دیکھتی ہوں: درد اور افسردگی کی ساعتیں، ملاقات اور خواہش اور لذت اور نرمی کے لمحے جن کے سہارے آج مجھے آنے والے دنوں کا تصور ملتا ہے۔ میں انھیں ہرگز تج نہ دوں گی۔

وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخا، ''وہی گھوم پھر کر اشیا کا جھگڑا۔ میں ابھی اور اسی وقت معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم بچوں کی پیدائش سے کیوں انکار کرتی ہو؟''

مزید برداشت کی تاب نہ لا کر میں چیخ اٹھی کہ کبھی خود اس نے بھی بچوں کی پیدائش سے انکار کیا تھا۔ وہ خاموش ہو رہا، لیکن بس تھوڑی ہی دیر کے لیے، پھر بولا، ''میں نے انکار کیا تھا تو شادی سے پہلے، اُس وقت جب بچوں کا ہونا نری حماقت ہوتا۔'' میں نے طنزاً کہا کہ ساری بات یہ تھی کہ وہ ان سے خائف تھا: وہ دوسرے، وہ شہر بھر کے شہدے، کہ وہ ان سے ان کی اجازت، برکت، اور موافقت کے لیے گزارش کیا کرتا تھا تاکہ وہ مجھ سے اور میں اس سے مل سکوں، تاکہ وہ مجھے اپنی بانہوں میں بھر سکے اور میں اسے اپنی بانہوں میں، تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی محبت میں غرق کر سکیں۔ یہ وہ تھے جو ہمارے لیے ہماری ملاقاتوں کی جگہوں، ان تک ہمارے قدموں کی تعداد، اور وقت کا تعین کیا کرتے تھے، ساتھ ہی ساتھ ہماری آواز کی بلندی کی حد بندی بھی، اور ہماری سانسوں کا شمار؛ اور میں انھیں تنہائی میں، چوری چوری، ہماری محبت کا مذاق اڑاتے، اپنے محبوب جسموں کے ساتھ مباشرت کرتے، نہایت بے شرمی کے ساتھ دن میں تین بار شکم سیری کرتے، من پسند قہوے کے فنجان اور عرق کی صراحیوں کے ہمراہ سگریٹ پھونکتے، قہقہہ زن، ہماری محبت کی داستان کو نہایت سوقیانہ چٹخارے لے کر چباتے، ہمارے رویے کے لیے قواعد بناتے دیکھا کرتی تھی، وہ قواعد جنھیں آنے والی کل ہم عملی جامہ پہنا سکیں۔

اس نے گھٹی گھٹی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا، ''میں دوسروں کی کب پروا کرتا ہوں؛ میں ایک

اور عورت سے بندھا ہوا تھا۔''

آہ! میں آخر کس طرح یہ عذاب برداشت کر سکتی ہوں، یہ تمام جنون جو مجھے اس سے ہے! وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی بزدلی کا اعتراف کیا کرتا تھا، کہ وہ اس دوسری عورت کو ٹھوس، بڑی کڑوی حقیقت سے کہ اسے اس سے محبت نہ رہی تھی، نہ ہرگز کبھی ہو سکے گی، آگاہ کر دینے سے عاجز ہے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا تھا کہ اس کے لیے یہ آسان نہیں، کہ اب وہ اتنا بے اعتنا اور پتھر دل نہیں کہ وہ دوسرا انسان جس کو گذشتہ نو برس تک ہر صبح اٹھنے پر اس نے اپنے پہلو میں پایا تھا، اس دن اٹھ کر، اس کی آنکھوں میں گھور کر یہ کہہ سکے: ''تماشا ختم!'' اور پھر منھ موڑ کر چل دے۔ میں نے کہا کہ وہ میرے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھے، اور پوچھا کیا میرا گرم خون اس سے اب بھی فرش پر ٹپک رہا ہے؟ ''تم پاگل تھیں،'' وہ بڑبڑایا، ''تم پاگل تھیں، جب تم نے اپنے خیال کو پورا کرنا چاہا۔ میں نے دروازہ کھولا، اسی کمرے میں داخل ہوا اور تمھیں کاؤچ پر پڑا ہوا پایا۔ تمھارے ہاتھ کی نسیں کٹی ہوئی تھیں اور تمھاری انگلیاں خون کے سمندر میں تیر رہی تھیں۔ تم جنونی تھیں، میں نے تمھیں تقریباً کھو دیا تھا۔''

میں اداس اداس مسکرا دی، اس حال میں کہ اس کی قمیص کھینچ کر اپنے سینے پر پھیلا رہی تھی، اور میرا چہرہ اس میں ڈوب کر اس کی مانوس، مردانہ بو سونگھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ڈرامے میں میرا کردار اس کا متقضی تھا کہ اختتام سے پہلے خود کو فنا کر دوں، اور فنا کی صورتوں میں صرف وہی موت قبول اور برداشت کر سکتی تھی جو مجھے بسرعت معدوم کر دینے کی اہل ہو، نہ کہ آہستہ خرام اور سفاک رینگ — بالکل اس کچھوے کی طرح جو ''کتے کی موت'' نامی فلم میں، ریگ زار میں اپنا راستہ کھو بیٹھا تھا اور اب سورج کی تمازت میں دریا کے کنارے کی تلاش میں رینگ رہا تھا۔ اس نے افسردگی سے دہرایا کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس سے اپنی محبت میں اس درجہ سنجیدہ ہوں۔ میں نے استہزاءً پوچھا کہ کیا میری محبت کی صداقت کے ثبوت میں وہ میرے خود کو فنا کر دینے کا منتظر تھا؟ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کی محبت میں خود کو بالکل گم کر دیا تھا، کہ ساری دنیا سے بے خبر، میں نظر نہ آنے والی آندھی تھی جو لوگوں کی انگلیوں سے دبے پاؤں پھسل کر، ان کے چہروں کو جھلساتی ہوئی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ اگر مجھے کسی چیز کا احساس تھا تو یہ جسموں کی گرانی تھی یا عمارتوں اور اس کے ہاتھوں کی بلندی۔ میں نے التجا کی کہ وہ میرے کچھ اور قریب آ جائے اور مجھے اپنے ہاتھ تھام لینے دے کہ میں انھیں تھامنے کی خواہاں ہوں۔ مگر

وہ دور کھڑا رہا — جامد، بے حس — بلکہ اس نے بسرعت مجھے متہم کیا کہ اس فلاکت، اور اس کے بعد کی فتح، کے باوجود بھی میں اس سے حاملہ ہونے کی مستقل منکر ہوں، کہ وہ اس انکار کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ مجھے اب اس سے محبت نہیں رہی۔

کیا؟ میں تڑپی۔ میں نے چیخ کر کہا کہ یہ طعنہ وہ مجھے ہرگز نہیں دے سکتا۔ کل رات ہی کو لے لو: میں اس کے پہلو میں پڑی تھی اور اس نے خود کو گہری نیند کے سپرد کر دیا تھا، جبکہ میری آنکھیں کھلی تھیں، میں اپنے رخسار سے اس کی ٹھوڑی رگڑ رہی تھی، اس کا سینہ چوم رہی تھی، اس کی بانہوں میں حرارت کے لیے بھنچی پڑی تھی، اور بے کار ہی نیند کی متلاشی تھی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کا یوں پلک جھپکتے سو جانا اور میرا یوں ماہیِ بے آب اس کے پہلو میں پڑے تنہا تڑپتے رہنا میرے لیے کس قدر اذیت کا باعث تھا۔ اس نے فوراً مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا کہ اسے راتوں میں کوئی ایسی رات یاد نہیں جو میں نے جگ کر گزاری ہو، اور اسے یقین ہے کہ اس کے سوتے ہی میں بھی سو جاتی ہوں۔ کینہ میرے دل میں اتر آیا، اور میں نے کہا کہ یہ پہلی بار نہ تھی جو اس نے مجھے یوں اپنے پہلو میں بیدار اور اکیلا چھوڑا تھا۔ پھر میں نے گذشتہ شب کا واقعہ صراحتاً پورے کا پورا ذکر کیا۔ کس طرح وہ سو رہا تھا، کس طرح اس کا تنفس نرمی سے آ جا رہا تھا جبکہ میں، اس کے پہلو میں پسری، خاموشی سے سگریٹ پھونک رہی تھی، کہ کمرے کی خاموشی میں، دھویں کے پار، میں نے چادر سے ایک پاؤں کو اچانک پھسلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے اسے ہلانے کی کوشش کی، مگر وہ دوسرا پاؤں ٹس سے مس نہ ہوا، اور ایک سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے ہلانا چاہا، لیکن وہ ساکت ہی رہا۔ پھر میں نے اپنے چہرے کو جلدی سے اس کے بالوں میں دفن کر دیا تھا۔ میں خوف زدہ تھی۔ پھر وہ ہلا تھا اور ساتھ ہی اس کا پاؤں بھی۔ میں خاموش رویا کی۔ میں نے سوچا تھا، میں نے محسوس بھی کیا تھا، میں اس کے اور اپنے پاؤں میں فرق کرنے سے عاجز تھی۔ دبی دبی سی آواز میں اس نے کہا تھا: ''اس زمانے میں لوگ محبت کی وجہ سے نہیں مرتے!'' موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فوراً جواب دیا کہ پھر یہ بھی درست ہے کہ اس زمانے میں لوگ بچے نہیں جنتے! پرانے زمانے میں لوگوں کو علم ہوا کرتا تھا کہ بچہ کہاں پیدا ہوگا، ممکناً کس سے مشابہہ ہوگا، لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ وہ اس کے لیے اونی کرتے اور موزے بنتے، اس کے کپڑوں کے حاشیوں پر، کالروں اور جیبوں پر کشیدہ کاری سے رنگین پھول اور چڑیاں بناتے، اس کے

لیے تحفتاً طلائی صلیبیں اور ''ماشاءاللہ'' کی الواح، نیلے پتھر سے مرصع کھلی ہتھیلیاں اور ایسے آویزے جمع کرتے جن پر اس کا نام کندہ ہوتا۔ ولادت سے پہلے ہی وہ اس کے لیے ایک دایہ مخصوص کر رکھتے، ولادت کا دن مقرر کرتے، اور بچہ ٹھیک وقتِ معینہ پر کوکھ کے اندھیروں سے خود کو روشنیوں کی دنیا میں پھینک دیتا۔ تب وہ بچے کے نام پر زمین کا ایک ٹکڑا درج کراتے، اس کے لیے کرائے پر مکان لیتے، اس کے لیے اس کے ساتھیوں کا انتخاب کرتے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ اسے کس اسکول میں پڑھنے بھیجیں گے، اور یہ بھی کہ وہ کس پیشے کے لیے تعلیم حاصل کرے گا، اور یہ بھی کہ وہ ممکنا کس شخص سے محبت کرے گا اور، انتہائے کار، اس کی قسمت سے اپنی تقدیر جوڑے گا۔ لیکن یہ سب بہت پہلے کی بات ہے، تمھارے اور میرے والدین کے زمانے کی بات۔ وہ بولا: ''تمھارے خیال میں کیا واقعی بیس سال کی مدت ایک زمانے کے مساوی ہے؟ بیس برسوں میں بدلا ہی کیا ہے؟ کیا تم اور میں مل کر بچے کی حاجتوں کو پورا نہیں کر سکتے؟'' ضرب کی شدت کو کم کرنے کے خیال سے میں بول اٹھی کہ شادی سے قبل میں اس ننھے بچے کے مانند تھی جو اپنی پشت پر پڑے پڑے کھڑکی سے باہر پھیلے ستاروں کو ٹکر ٹکر دیکھے جاتا ہے، اور انھیں چن لینے کی خواہش سے مغلوب ہو کر ان کی جانب اپنے ننھے منے ہاتھ بڑھا دیتا ہے: میں اس خواب، اس نا قابلِ تعبیر خواہش سے اپنی دل جوئی کیا کرتی تھی، اس سے چمٹی رہتی اور اس کے حقیقت بن جانے کی تمنا کرتی۔ اس نے پوچھا: ''گویا تم مجھے مسلسل دھوکا دے رہی تھیں؟''

کیا؟ معاً مجھے محسوس ہوا کہ اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا ہے، کہ وہ معرکہ سر کرنے کے لیے مجھ پر حملہ آور ہوا ہے۔ میں کہہ اٹھی کہ وہ عورت، صرف وہی عورت جو اپنے مرد سے نا آسودہ ہو، نہایت بے تابانہ اشتیاق سے بچے کی خواہش کرتی ہے، تا کہ اپنی دنیا میں سمٹ جائے اور اپنے بچے کے وجود سے مسرور ہو کر خود کو آزاد محسوس کر سکے۔ اس نے فوراً قطع کلام کیا: ''تو کیا تم نا آسودہ تھیں؟'' میں نے جواباً کہا کہ ہم دونوں ہراساں تھے، ہم زری کی نامعلوم گزرگاہوں کی انتہا تک کبھی سفر نہ کر سکے تھے۔ ہم خوف سے لرزاں تھے، اور ہم ہمیشہ اجنبی چہروں سے ٹکراتے رہے ہیں اور ان کی آواز سنتے رہے ہیں۔ اس کے لیے، اپنے لیے میں نے موت کا مقابلہ کیا ہے، تا کہ زندہ رہ سکوں۔ وہ غلطی پر ہے۔ وہ مجنونانہ محبت جو مجھے اس سے ہے، اس پر شک کر کے وہ غلطی کر رہا ہے۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں تمھیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' میں حملہ آور ہوئی اور

بولی کہ ساری مصیبت کی جڑ اس کی یہی نافہمی ہے؛ اور اگر میں نے کبھی اسے بتا بھی دیا کہ کیوں مجھ میں حاملہ ہونے کی جرأت نہیں، اور میں ایسی غلطی کی مرتکب کبھی نہیں ہوں گی — تو یہ بھی وہ نہ سمجھ سکے گا۔
''غلطی،'' وہ چیخا، ''غلطی؟'' میں اس کی قمیص سے کچھ اور چمٹ گئی تاکہ اس سے توانائی حاصل کر سکوں، اور پھر آہستہ آہستہ، بہت ہی مدھم لہجے میں میں نے اسے بتایا کہ میں اس بچے کی قسمت کے بارے میں کس قدر خوف زدہ ہوں جسے ہم اس دنیا میں لا پھینکیں گے۔ آخر میں کس طرح تصور کر سکتی ہوں کہ میرا بچہ، ایک وجود جس نے میرے خون سے غذا حاصل کی ہو، اپنی کوکھ کے اندھیروں میں جسے میں نے چمٹائے رکھا ہو، اپنے تنفس، اپنے دل کی دھڑکنوں اور اپنے یومیہ کھانے میں اپنا شریک کیا ہو، ایک وجود کہ جسے میں نے اپنے خدوخال اور یہ زمین دی ہو، مستقبل میں ایک دن وہ مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر، راکٹ میں بیٹھ کر، چاند پر جا بسے گا؟ اور کسے معلوم کہ وہ خوش بھی رہ سکے گا یا نہیں؟ میرے تصور میں میرا بچہ سفید ربنوں سے سج دھج کر آتا ہے، اپنے تروتازہ چہرے کی بشاشت کے ساتھ ایک کرسی سے بندھا ہوا، جو شیشے کے ایک گولے میں رکھی ہوئی ہے، اور یہ گولا خاکی رنگ کے ایک طویل عمود کے بالائی سرے سے جڑا ہے، اور یہ عمود جو میرے شارلستونی سائے کی سلوٹوں میں جا کر گم ہو جاتا ہے۔ وہ بٹن دباتا ہے، غبار کا ایک بادل بتدریج اٹھتا ہے، اور تیر سے مشابہ وہ شے خود کو فضا میں پھینک دیتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔

وہ دیر تک چپ رہا۔ دریں اثنا صبح کا اجالا اس کے چہرے سے چھن کر کمرے کے گوشوں میں پھیلنے لگا۔ اس کا چہرہ کسی تاثر سے خالی تھا، اور وہ دور کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی فضا میں یونہی خالی پن سے ایک تیر نما شے اور ایک ننھے سے چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی بھنوؤں کے مابین پھیلی ہوئی رگ میں گرہیں سی پڑ گئیں۔ تشویش اور بوجھ کے آثار اس کے چہرے سے مترشح تھے۔ خود میں بھی خاموش تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

اسے اپنے بے حد نزدیک، فضا میں راکٹ پھینکنے والے بلند مینار کی طرح کھڑے پا کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور میں نے بڑبڑاتے ہوئے اس سے کہا کہ مجھے اس کے برہنہ جسم سے والہانہ محبت ہے، اور جب وہ اس جسم کو کپڑوں سے ڈھک دیتا ہے، بالخصوص جب وہ اپنی ٹائی کی گرہ لگاتا ہے، تو مجھے بے حد اجنبی لگتا ہے، وہ اجنبی جو ہمارے گھر، خاندان کے بزرگ سے ملنے آیا ہو۔ اس نے اپنی

بانہیں وا کردیں اور مجھ پر جھک گیا۔ میں جلدی سے اس کی بانہوں میں سمٹ آئی اور دیوانگی سے بڑبڑانے لگی:

''مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے...'' اور اس کی سرگوشی میرے بالوں سے چھن کر ابھری:

''تم میرا موتی ہو!''

پھر اس نے اپنی ہتھیلی میرے لبوں پر پھیلا دی، اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنے حلقے میں کچھ اور تنگ کرتے ہوئے حکم دیا:

''آؤ چاند کو چلیں —— تم اور میں!''

❄

لیلیٰ بعلبکّی

چاند کی طرف شفقت کا سفینہ

❋

جس طرح بائیسکل، یا کوئی پہیہ، ایک بار گردش میں آ جائے تو اپنی اندرونی حرکت کے بل پر گھومتا چلا جاتا ہے لیکن اس کا زور ٹوٹتے ہی زمین پر آ رہتا ہے، بالکل اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان جب ایک بار کھیل شروع ہو جائے تو اسی وقت تک جاری رہ سکتا ہے جب تک اس میں آگے بڑھنے کا امکان ہو۔ آگے کی طرف حرکت کل کے مقابلے میں اگر آج زیادہ نہیں، تو بس کھیل ختم شد۔

الیک (Oleg) منگل کی شام کا بڑی بے صبری سے منتظر تھا، کیونکہ تب زویا (Zoya) رات کی شفٹ پر ہوگی۔ ان کے کھیل کا بھڑک دار، سجاوٹوں سے مرصّع پہیہ گھومتا ہوا اس مقام سے یقیناً آگے نکل جائے گا جہاں پہلی شام پہنچا تھا، اور وہاں سے بھی دور تر جہاں اتوار کو اس نے اپنے اندر وہ ابلتی ہوئی قوت محسوس کی جو اس پہیے کو آگے کے رخ دوڑانے کی اہل تھی۔ اور تو اور، اس نے زویا میں بھی ہو بہو ایک ایسی ہی قوت کی پیش بینی کر ڈالی۔ پھر وہ بڑے جوش کے عالم میں اس کا انتظار کرنے لگا۔

اس سے ملاقات کے واسطے وہ پہلے باہر باغیچے میں گیا۔ اسے وہ خم کھاتی ہوئی روش خوب معلوم تھی جہاں سے ہوتی ہوئی زویا آتی ہوگی۔ وہاں اس نے سستے makhorka کے دو سگریٹ بٹے اور پی بھی ڈالے۔ معاً اسے خیال آیا کہ اپنے ناپ سے بڑی باتھ روب میں وہ کس قدر مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔ وہ اس حلیے میں تو زویا کے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ پھر اندھیرا بھی ہو چلا تھا۔ وہ وارڈ لوٹ آیا، باتھ روب سے نجات حاصل کی، بوٹ اتارے، اور شب خوابی کے لباس ہی میں، جو خود کچھ کم مضحکہ خیز نہ تھا، زینے کے نچلے حصے کے پاس انتظار کرنے لگا۔ اپنے سرکش بالوں کو جس قدر ممکن ہو سکا اس نے کنگھا کر کے پیچھے کی طرف جما دیا تھا۔

وہ ڈاکٹروں کے ڈریسنگ روم سے نکلی۔ خوب دیر سے اور دم بخود۔ الیک کو دیکھتے ہی اس کی بھنویں اوپر کو اٹھیں، حیرت کے مارے نہیں، بلکہ اس اطمینان سے کہ یہ نہایت موزوں اور حسبِ حال تھا، وہ الیک کے ٹھیک وہیں پائے جانے کی متوقع تھی، کہ یہی اس کا مقام تھا: زینے کے نچلے حصے میں۔

''کینسر وارڈ'' (*Cancer Ward*) کا اٹھائیسواں باب: "Even at the Brink of the Grave"

وہ رکی نہیں۔ اور الیک اس خیال سے کہ پیچھے نہ رہ جائے، اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے بیک وقت دو دو ڈگ بھرتا ہوا، اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کوئی نئی بات؟" عجلت سے آگے بڑھتے ہوئے زویا نے پوچھا، لیکن انداز ایسا تھا جیسے کسی ماتحت اہل کار سے مخاطب ہو۔

(نئی؟ عدالتِ عالیہ میں تبدیلی! لے دے کر بس یہی نئی بات تھی۔ لیکن اس کو ٹھیک سمجھنے کے لیے برسوں کی تیاری ضروری تھی، تاہم، ظاہر تھا کہ یہ وہ بات نہیں تھی جس کو سننے کی زویا منتظر تھی۔)

"میں نے تمھارے لیے نیا نام چنا ہے۔ آخر کار مجھے پتا چل ہی گیا کہ تمھارا کیا نام ہونا چاہیے۔"

"اچھا—— کیا نام؟" زویا نے بڑے پھرتی سے زینہ چڑھتے ہوئے پوچھا۔

"چلتے میں نہیں بتا سکتا۔ بہت اہم بات ہے۔"

اب وہ زینے کے اوپر پہنچ رہے تھے۔ وہ رک گیا اور زویا آخری سیڑھیاں پھلانگ گئی۔ زویا کو یوں اپنے آگے بھاگتی دیکھتے ہوئے الیک کی نظر اس کی ٹانگوں پر جا پڑی، جو موٹی اور بھاری بھاری تھیں، تاہم اس کے بھرے پُرے جسم پر خوب جچتی تھیں، بلکہ ایک مخصوص ذوق والوں کے لیے بڑی پُرکشش بھی تھیں۔ درست، پھر بھی عورت کی ٹانگیں سڈول ہوں، لطیف ہوں—— وے گا (Vega) کی ٹانگوں کی طرح—— تو مرد کی کیفیت کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

اسے اپنے پر بڑا تعجب ہوا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی اس طرح استدلال نہیں کیا تھا۔ نہ ہی عورت ذات کو کبھی اس اعتبار سے دیکھا تھا۔ وہ کبھی ایک عورت سے دوسری کی طرف نہیں بھاگتا پھرا تھا۔ اس کے دادا کہا کرتے تھے کہ اس قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں عورتوں کا سودا ہو گیا ہوتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ کہاوت ہے، بھوک لگے تو کھاؤ، اور جوانی میں محبت کرو۔ تاہم جوانی کے ایام میں یہ سب الیک سے رہ گیا تھا۔ اور اب، جس طرح خزاں کا پودا زمین سے بچی کھچی غذا حاصل کرنے میں بڑی بیتابی دکھاتا ہے کہ کہیں گرمیاں ضائع کر دینے کا پچھتاوا نہ رہ جائے، اسی طرح الیک، زندگی کی اس بازرسی کے دوران اس کی زوال پذیری کے باوجود—— اور وہ بلاشبہ زوال پذیر ہی تھی—— بڑی بے تابی سے عورتوں کی طرف دیکھتا اور انھیں نظروں ہی سے پی جاتا، کچھ ایسے کہ بیان کرنا پڑ جائے تو عاجز رہے۔ دوسرے مردوں کے مقابلے میں اسے اس بات کا بڑا واضح احساس تھا کہ صنفِ نازک مرد کو کیا

کچھ دینے پر قادر ہے، کیونکہ برسہا برس تک وہ ان کے دیدار تک کو ترس گیا تھا، یا کبھی عورت کو دیکھنے کا موقع ملا بھی تو بہت دور سے۔ اسے عورتوں کی آواز سننے کو کبھی نہیں ملی تھی، اسے تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس آواز کا زیر و بم کیسا ہوتا ہے۔

زویا نے اپنی شفٹ کا مقررہ کام شروع کر دیا۔ وہ چاروں طرف لٹو کی طرح گھومتی پھر رہی تھی۔ پھرکتی ہوئی اپنے ڈیسک تک پہنچی، وہاں سے اس طرف نکل گئی جہاں فہرستِ کار ٹنگی ہوئی تھی، پھر دواؤں کی الماری تک آئی، اور وہاں سے وارڈوں کی طرف چل دی۔

الیک اسے کام نمٹاتے دیکھتا رہا۔ جب اسے گمان ہوا کہ وہ چند ثانیے نکال سکتی ہے، تو فوراً پاس آ دھمکا۔

''تو اسپتال میں کوئی نئی وئی بات نہیں ہوئی؟'' زویا نے انجکشن کی پچکاری کی سوئی کو برقی چولہے پر جراثیم سے پاک کر کے impule تیار کرتے ہوئے اپنی شہد جیسی آواز میں پوچھا۔

''کیوں نہیں؟ بہت بڑی بات ہوئی۔ نظام الدین بہراموویچ (Nizamutdin Bakhramovich) نے معائنہ کر ڈالا۔''

''ارے نہیں؟ چلو اچھا ہوا جو میں موجود نہ تھی! ہاں تو کیا ہوا؟ تمھارے بوٹ ضبط کیے؟''

''بوٹ ووٹ ضبط نہیں کیے، لیکن ہم دونوں میں ہلکی سی جھڑپ ضرور ہو گئی۔''

''خیر باشد؟''

''یوں سمجھو بڑا شاہانہ جلوس تھا۔ پورے پندرہ گاؤن — میرا مطلب ہے مختلف شعبوں کے سربراہ، سرجن، بڑے ڈاکٹر، چھوٹے ڈاکٹر، اور بہت سے ایسے بھی جنھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا — وارڈ میں داخل ہوئے اور چیف ڈاکٹر ہمارے سرھانے والے اسٹینڈز کی طرف جھپٹا۔ لیکن ہمارے مخبروں نے ہمیں پہلے ہی سے چوکنا کر دیا تھا، اور ہم حملے کی خاطر خواہ تیاری کیے بیٹھے تھے۔ نہیں بھئی، اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ملی۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ بڑا مایوس ہوا۔ بس تبھی وہ میرے کیس کے بارے میں بتانے لگے، اور لیوڈمیلا آفناسیونا (Lyudmila Afanasyevna) ایک بھاری غلطی کر بیٹھی۔ وہ میری فائل سے پڑھ رہی تھی...''

''فائل؟ کیسی فائل؟''

''میری کیس ہسٹری۔ بھئی میں اس کا تصور ہمیشہ ایک فائل کے طور پر ہی کرتا ہوں۔... خیر اس نے میرے مرض کے بارے میں جو پہلی تشخیص ہوئی تھی وہ دہرادی، جس سے بھانڈا پھوٹ گیا کہ میں اصلاً قازقستان کا باشندہ ہوں۔' کیا؟' نظام الدین دہاڑا۔' یعنی باہر کے علاقے کا ہے؟ تمھارا مطلب ہے کہ ہم نے غیر علاقوں کے مریضوں کو لینا شروع کر دیا ہے جبکہ خود اپنے علاقے کے واسطے ہمارے پاس گنجائش نہیں؟ اسے فوراً چلتا کرو!'

''لیکن وارڈ میں آدھے مریض غیر علاقوں کے ہی ہیں!'' زویا حیرت سے چیخ پڑی۔

''اور نہیں تو کیا۔ بس اتفاق تھا جو مجھ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ خیر، لیوڈمیلا آفناسیونا اس سے یکبارگی یوں الجھ پڑی جیسے انڈے سینتی ہوئی کوئی مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت کی خاطر بڑی تندی سے کڑکڑانے لگے۔ سچ پوچھو تو مجھے اس کی ذرا بھی توقع نہ تھی۔ نظام الدین سے بولی،'' یہ ایک بے حد غیر معمولی طبی کیس ہے! ہمیں اس مریض کو سائنسی مشاہدے کے واسطے یہاں رکھنا ہی ہوگا...'' اس کی حمایت نے میرے لیے اچھی خاصی الجھن کھڑی کر دی۔ کل پرسوں کی بات ہے میں خود اس سے حجت کر رہا تھا کہ مجھے ڈس چارج کر دے، لیکن اس نے مجھے جھڑکی دے کے خاموش کر دیا تھا۔ اور اب یہی لیوڈمیلا آفناسیونا مری حمایت میں لڑنے مرنے پر تُلی کھڑی تھی۔ نظام الدین سے بس اتنا کہنے کی دیر تھی،' اچھا ٹھیک ہے،' اور شام کے کھانے کے وقت تک یہاں سے میری چھٹی ہو جاتی اور تمھیں مجھے دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔''

''تو کیا تم نے میری خاطر' اچھا ٹھیک ہے' نہیں کہا؟''

''اور کس کی خاطر؟'' کستاگلوتف (Kostoglotov) کی آواز مدھم پڑ گئی۔'' اب تم نے اپنا پتا دتا تو مجھے دے نہیں رکھا۔ تمھیں کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرتا؟''

وہ ہنوز پچکاری کی صفائی میں مشغول تھی، چنانچہ وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ آیا اسے اس کی بات پر اعتبار آیا بھی تھا یا نہیں۔

''میں اب لیوڈمیلا آفناسیونا کو ایسی نازک صورت حال میں تو نہیں چھوڑ سکتا تھا،'' اس نے قدرے بلند آواز میں بات جاری رکھی۔'' بس زبان کو لگام دے کر لکڑی کے گدے کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔'' نظام الدین بولے گیا:' رجسٹریشن آفس جا کر تمھیں اور نہیں تو پانچ اس جیسے کیس لا کر

دکھا سکتا ہوں۔ اور لطف یہ کہ بھی اپنے علاقے کے! اسے فوراً ڈس چارج کرو!' شاید میں نرا بدھو ہی ہوں۔ یہاں سے گلوخلاصی کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ لیکن حماقت میں ضائع کر دیا۔ بس، مجھے لیوڈمیلا آفناسیونا پر رحم آ گیا۔ وہ یوں تیزی سے آنکھیں جھپکا رہی تھی جیسے بالکل پامال ہو کر رہ گئی ہو۔ میں نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائیں۔ حلق کھڑکھڑایا، اور بڑے اطمینان سے پوچھا: 'اور اگر میں ورجن لینڈز کا ہوں تو آپ مجھے کیسے ڈس چارج کر سکتے ہیں؟'

'اچھا، ورجن لینڈز پر رضاکارانہ طور پر آباد ہونے والا!' نظام الدین پر ہیبت طاری ہو گئی۔ (یہ بڑی بھاری سیاسی غلطی ثابت ہو سکتی ہے!) 'بھئی اب یہ بالکل الگ بات ہے۔ ملک ورجن لینڈز پر آباد ہونے والوں کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھتا،' وہ بولا اور آگے بڑھ گیا۔"

"آدمی تو تم خاصے حاضر دماغ ہو،" زویا نے سر ہلا کر کہا۔

"چالاکی کی تعلیم مجھے کیمپ میں ملی، زوین کا۔ میں پہلے ایسا نہیں تھا۔ میری بہت سی خصلتیں ذاتی نہیں، بلکہ کیمپ کی دین ہیں۔"

"اور لاابالی پن — یہ بھی وہیں سے ملا ہے؟"

"بالکل! میں اس لیے زندہ ہوں کہ رنج والم کا خوگر ہو چکا ہوں۔ مجھے یہ بات بڑی بے ڈھب لگتی ہے کہ جب ملاقات ہو تو لوگ رونے دھونے بیٹھ جائیں۔ اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے؟ کوئی بن باس تو مل نہیں رہا۔ کوئی ان کا ذاتی مال اسباب تو ضبط نہیں کیے لے رہا..."

"تو یہاں ایک مہینہ اور رہو گے؟"

"ارے نہیں بھئی۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے اور۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ جیسے میں نے لیوڈمیلا آفناسیونا کو سب کچھ بے چون و چرا بھوگنے کا قول دے رکھا ہو..."

اُبلتے پانی میں پچکاری خوب گرم ہو چکی تھی۔ زویا نے چھوا تو ایک دم اچھل پڑی۔

اس کے ذمے بڑا پریشان کن فریضہ آن پڑا تھا، اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ الیک کے نسخے میں ایک بالکل نئی قسم کے انجکشن تجویز ہوئے تھے۔ اور یہ جسم کے اس حصے میں لگائے جانے تھے جہاں درد کم سے کم محسوس ہو۔ لیکن دونوں کے درمیان گفتگو کا جو انداز قائم ہو چکا تھا اس کو دیکھتے ہوئے وہ یہ انجکشن اسے نہیں لگا سکتی تھی، ورنہ پورا کھیل ہی ختم شد! اور زویا اس کھیل سے دست

کش نہیں ہونا چاہتی تھی، کھیل تو کھیل، اس انداز گفتگو سے بھی نہیں۔ اور نہ خود ایک۔ دوبارہ ایسا ہونا اسی وقت ممکن تھا کہ پہیہ دور تک گھومتا چلا جائے، اور اس بار یہ بے تکلفی اور گہرے تعلق خاطر کی بنیاد پر ہوتا۔ زویا اپنے ڈیسک کی طرف لوٹ گئی اور اس سے ملتا جلتا انجیکشن احمد جان (Akhmadzhan) کے لیے تیار کرتے ہوئے بولی:

''انجیکشن لگواتے وقت دولتی تو نہیں جھاڑنے لگتے؟''

یہ سوال اور وہ بھی کستا گلوتف سے! وہ تو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بس ایسے ہی کسی موقعے کا منتظر بیٹھا تھا۔

''تم خوب جانتی ہو، زوین کا۔ اگر ان سے بچ سکوں تو ہمیشہ اسی کو ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ انجیکشن کون لگا رہا ہے۔ اگر ترگون (Turgun) لگا رہا ہو تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا شطرنج کا کھیل سدھارنے کا بے حد مشتاق ہے۔ چنانچہ ہم نے طے کر رکھا ہے کہ اگر جیت میری ہو تو انجیکشن نہیں لگائے گا، اور اگر اس کی، تو لگائے گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ مجھے ایک اسپ کم کی قید پر کھیلنا پڑتا ہے۔ رہی ماریا، تو اس کے ساتھ شطرنج نہیں کھیلی جا سکتی۔ وہ پچکاری سنبھالے آتی ہے اور چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی ہوتا ہے۔ میں مذاق کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہ حکم صادر کر دیتی ہے: 'مریض کستا گلوتف! انجیکشن لگوانے کے لیے کپڑا اتاریئے!' قسم لے لو جو اس کی زبان سے کبھی ایک بھی انسانی لفظ نکلا ہو۔''

''تم سے نفرت جو ہوئی نا۔''

''مجھ سے؟''

''ایک تم ہی سے نہیں، پوری مرد ذات سے۔''

''شاید اس کی کوئی معقول وجہ ہو۔ خیر، اب ایک نئی نرس آ پہنچی ہے۔ اس سے بھی حجت نہیں کر سکتا۔ الیامپیادا (Olimpiada) کے لوٹنے پر صورت حال اور بھی خراب ہو جائے گی۔ وہ ٹس سے مس ہونے والی اسامی نہیں۔''

وہ احمد جان کو انجیکشن لگانے چل دی۔ پیچھے ایک انتظار کرنے لگا۔

ایک اور وجہ بھی تھی، نسبتاً زیادہ اہم وجہ جس کے باعث زویا ایک کو یہ انجیکشن نہیں لگانا چاہتی

تھی۔ وہ اتوار سے مسلسل اسی ادھیڑبن میں تھی کہ ایلک کو بتائے یا نہ بتائے کہ ان انجکشنوں کا اس پر کیا اثر ہوگا۔

کیونکہ وہ تمام باتیں جو مذاق ہی مذاق میں دونوں ایک دوسرے سے کرتے رہے تھے، تو وہ اگر کبھی سچے تعلقِ خاطر میں بدل جائیں ــــ اس کا امکان بہرحال ضرور تھا ــــ اگر اس دفعہ معاملہ کمرے میں منتشر ملبوسات کو آزردگی سے سمیٹنے سے آگے بڑھ کر کسی ٹھوس اور پائیدار چیز میں تبدیل ہوگیا، اور زویا نے واقعی اس کی محبوبہ بن کر جلاوطنی میں اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ (آخرکار، وہ غلط تو نہیں کہتا تھا: کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ شادمانی کسی دور افتادہ علاقے میں تمھاری منتظر نہیں؟) تو اس صورت میں ایلک کے واسطے جو انجکشن تجویز ہوئے ہیں ان کا تعلق محض ایلک ہی سے نہ ہوتا بلکہ خود زویا سے بھی۔

اور وہ ان انجکشنوں کے خلاف تھی۔

"ہاں تو!" خالی پچکاری کے ساتھ لوٹتے ہوئے زویا نے چہک کر کہا۔ "جی کڑا کرلیا؟ مریض کستاگلوتف، چلو انجکشن لگوانے کے لیے جاکر کپڑے اتارو؟ میں بس ابھی آئی۔"

لیکن وہ وہیں بیٹھ گیا اور زویا کو ایسے آدمی کی نظر سے دیکھنے لگا جو اپنے کو مریض کا بے کو سمجھتا ہو۔ وہ تو انجکشن لگوانے کے بارے میں سرے سے سوچ ہی نہیں رہا تھا: اس کا خیال تھا کہ اس بات پر ان کا اتفاق ہو چکا تھا۔

اس نے زویا کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو بے حد نمایاں تھیں۔

"چلو کہیں چلیں، زویا!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

وہ جتنی آہستگی سے بولتا جارہا تھا، اسی تناسب سے اس کا لہجہ گہرا ہوتا جارہا تھا۔

"کہیں؟" وہ متحیر ہوکر بولی، پھر ہنس پڑی۔ "شہر؟"

"ڈاکٹروں کے کمرے میں۔"

زویا نے اس کی آنکھوں کی بے پناہ شدت کو جذب کرتے ہوئے ہنسی مذاق سے عاری لہجے میں کہا:

"نہیں ایلک، میں نہیں جاسکتی۔ اتنا سارا کام پڑا ہے۔"

اس نے، بظاہر، سمجھنے سے انکار کر دیا۔

''اب چلو بھی۔''

''ٹھہرو۔'' اسے یاد آ گیا۔ ''مجھے... کے لیے آکسیجن کا تھیلا بھرنا ہے۔'' اس نے زینے کے طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ممکن ہے اس نے مریض کا نام بھی لیا ہو لیکن الیک کو سنائی نہ دیا ہو۔ ''آکسیجن ٹینک کی ٹبلبی بری طرح بند ہو گئی ہے۔ تم چاہو تو اسے کھولنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔ آؤ۔''
پھر وہ الیک کی قیادت کرتی ہوئی زینہ اتر کر لینڈنگ پر آ گئی۔

وہ بد قسمت، آگے کو نکلی ہوئی ناک والا زرد رو آدمی (وہ ہمیشہ سے ہی اس قدر مختصر تھا یا بیماری کی وجہ سے سوکھ سکڑ گیا تھا، کہنا مشکل تھا) جسے پھیپھڑے کا سرطان چاٹ گیا تھا، اور جو اتنا شدید علیل تھا کہ ڈاکٹر اپنے گشت پر اب اور اس کے پاس پوچھ گچھ کے لیے نہیں ٹھہرتے تھے، اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھیلے سے آکسیجن لے رہا تھا۔ اس کے سینے سے اٹھنے والی خرخراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ پہلے بھی بہت بیمار رہ چکا تھا، لیکن آج اس کی حالت کچھ زیادہ ہی دگر گوں تھی۔ اتنا تو ایک ناتجربہ کار آنکھ بھی صاف دیکھ سکتی تھی۔ آکسیجن کا ایک تھیلا بس کسی دم ختم ہوا چاہتا تھا، دوسرا اس کے پہلو میں خالی پڑا تھا۔

اس پر اتنی شدید بے خودی طاری رہتی کہ اسے لوگوں کی آمد و رفت کا احساس بھی نہ ہوتا۔

انھوں نے خالی تھیلا اٹھایا اور نیچے چلے گئے۔

''اس کا کس قسم کا علاج ہو رہا ہے؟''

''کسی قسم کا بھی نہیں۔ آپریشن کے قابل نہیں۔ ایکس ریز سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔''

''تم لوگ یہاں سینہ کھول کر آپریشن نہیں کرتے؟''

''اس طبی مرکز میں تو نہیں۔''

''تو پھر کیا یہ مر جائے گا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے باوجود کہ وہ اسے زندہ رکھنے کے واسطے آکسیجن کے تھیلے اٹھائے لا رہے تھے، جلد ہی اسے بھول بھال گئے، کیونکہ کوئی چیز، کوئی دلچسپ چیز بس اب، کسی لمحے، رونما ہونے والی تھی۔

آکسیجن کا لمبا سا ٹینک ایک علیحدہ اور مقفل راہداری میں کھڑا تھا جو ایکس رے کے کمرے کے

فوراً بعد آتی تھی، وہی راہداری جہاں کبھی گنگارت (Gangart) تربتر اور جاں بلب الیگ کو لاکر ڈال گیا تھا (اور یہ ''کبھی'' بمشکل تین ہفتے پہلے کی بات تھی)۔

اگر راہداری کے طول میں لگی ہوئی برقی روشنیوں میں سے دوسری نہ جل رہی ہو (عموماً پہلی والی جلائی جاتی تھی)، تو وہ گوشہ جہاں آکسیجن ٹینک کھڑا تھا مکمل تاریکی میں ہوگا۔

زویا ٹینک سے قد میں چھوٹی تھی، الیگ بلندتر۔

وہ زویا کے پیچھے کھڑا اس کے بالوں کی مہک سونگھنے لگا جو اس کی ٹوپی کے باہر جھانک رہے تھے۔

''لبلبی بڑی مضبوطی سے بند ہے،'' زویا نے شکایت کی۔

الیگ نے لبلبی کے دستے پر انگلیاں جمائیں اور جھٹ پٹ کھول دیا۔ دبی دبی سی سی کی آواز کے ساتھ تھیلا بھرنے لگا۔

تب اسی ہاتھ سے جو الیگ نے لبلبی سے ہٹایا تھا، اس نے زویا کی آزاد کلائی تھام لی۔ دوسری سے اس نے آکسیجن کا تھیلا پکڑا ہوا تھا۔ زویا نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی نہ اظہار تعجب، بس ٹکر ٹکر تھیلے کو بھرتا ہوا دیکھتی رہی۔

الیگ کا ہاتھ کلائی سے سرکتا ہوا پہلے اوپر بازو تک پہنچا، پھر کہنی، اور پھر شانے تک۔ ایک قطعی بے ضرر اور معصوم کھوج، تاہم دونوں کے لیے ازبس ضروری بھی، ان کے لفظوں کی آزمائش، کہ دیکھیں وہ انھیں پوری طرح سمجھ بھی سکے ہیں۔

اور وہ سمجھ سکے تھے۔

اس نے زویا کے ماتھے پر جھولتی لٹ کو اپنی دو انگلیوں سے منتشر کر دیا۔ زویا نے اس حرکت پر نہ اعتراض کیا، نہ اس سے گریزاں ہی ہوئی، بس آنکھیں تھیلے پر جمائے رکھیں۔

اس نے زویا کے شانوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے کر اس کے پورے جسم کو اپنی طرف جھکا دیا، اور، پایان کار، اس کے ہونٹوں تک جا پہنچا۔ وہ ہونٹ جنھوں نے اس کے ساتھ اس قدر ہنسی مذاق کیا تھا۔

زویا کے ہونٹ جب اس کے ہونٹوں سے ملے تو وا تھے نہ نرم، نہ ہی ڈھیلے ڈھالے، بلکہ تنے ہوئے، ردِعمل سے گرم جوش، تیار۔

یہ سب اس نے چشم زدن میں محسوس کر لیا؛ اور اس چشم زدن سے پہلے کا اسے یاد نہ رہا تھا، وہ بھول گیا تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ ہونٹوں ہونٹوں میں فرق بھی ہوتا ہے اور بوسے مختلف بھی ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض، بعض دوسروں سے کہیں زیادہ پسندیدہ ہوتے ہیں، اور لذیذ تر۔

وہ کھیل جو بس چھیڑ چھاڑ سے شروع ہوا تھا، اب طویل اور دیرپا بن چکا تھا، ایسی غیر مختتم پیوستگی میں بدل چکا تھا جسے نہ وہ روک سکتے تھے، نہ روکنا چاہتے تھے۔ وہ ابد تک اسی حالت میں رہ سکتے تھے: لبوں کو پہلے زور سے بھینچتے اور پھر ساتھ ساتھ حرکت دیتے ہوئے۔

لیکن کچھ دیر بعد، دو صدیوں بعد، ان کے ہونٹ، بہر حال، جدا ہو ہی گئے، اور ایک نے دوبارہ نظر بھر کے زویا کو دیکھا اور اسے یہ سوال کرتے ہوئے سنا:

''چومتے میں تم اپنی آنکھیں کیوں میچ لیتے ہو؟''

تو کیا اس نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں؟ اسے معلوم نہیں تھا، اسے اس کا دھیان نہیں رہا تھا۔

وہ ان غواصوں کی طرح تھے جو دم لے کر پھر سے اس صدف کی جستجو میں غوطہ مار جاتے ہیں جو گہرائی میں بالکل سمندر کے فرش پر پڑا ہوا ہو۔ ان کے ہونٹ پھر سے آ ملے، لیکن اس بار اسے پتا چل گیا کہ اس نے واقعی اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور اس نے فوراً انھیں کھول دیا۔ پھر اس نے ترچھی نظر سے اس کی سرخی مائل بادامی آنکھوں کو دیکھا تو انھیں اپنے سے بہت قریب پایا، ناقابلِ یقین حد تک قریب، اور وہ اسے سفاک نظر آئیں۔ زویا نے اسے چوما، ایک بار پھر اپنے تجربہ کار، مضبوطی سے بھینچے ہونٹوں کے ساتھ۔ اس نے انھیں ذرا بھی تو وا نہیں ہونے دیا، بس خفیف سی ایک طرف کو جھولی اور مستحکم نظروں سے اسے دیکھنے لگی، جیسے آنکھوں سے تصدیق کرنا چاہتی ہو کہ ایک ابدیت سے دوسری اور پھر تیسری کے سفر میں ایک پر کیا کچھ بیت رہی تھی۔

اچانک اس نے رخ پھیرا، تڑپ کے جدا ہوئی، اور چیخ ماری:

''لبلبی!''

خدایا — لبلبی! اس نے ہاتھ بڑھا کر لبلبی بند کر دی۔ تھیلا پھٹ پڑا ہوتا۔

''یہ سب چوما چاٹی کا کیا دھرا ہے!'' زویا نے نامکمل آہ بھری اور کہا۔ اس کا سانس ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ ماتھے پر بالوں کی لٹ پریشان ہو چکی تھی اور اس کی ٹوپی ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔

زویا نے بالکل ٹھیک کہا تھا، تاہم ان کے ہونٹ پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے اور دونوں نے اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ایک دوسرے کو چمٹا لیا۔

راہداری کا دروازہ شیشے کا تھا اور عین ممکن تھا کہ گوشے سے باہر کو نکلی ہوئی ان کی ایک دوسرے میں پروئی ہوئی کہنیوں پر ـــــ زویا کی سفید، اس کی گلاب کی رنگت کی ـــــ کسی کی نظر جا پڑتی۔ لیکن اسے گولی مارو۔

جب الیگ کا سانس واپس آیا تو وہ ہنوز زویا کا سر اپنے ہاتھوں سے پیچھے کی طرف سنبھالے ہوئے، ٹھیک اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا:

''زالاتون چیک! تمھیں اسی نام سے پکارا جانا چاہیے۔ 'سنہری بال'۔''

''زالاتون چیک؟'' اس نے دہرایا، دھیرے دھیرے، جیسے لفظ سے کھیل رہی ہو، اسے آزما کے دیکھ رہی ہو۔

(پیار کے نام کے طور پر ذرا برا نہیں۔ چلے گا۔)

''تمھیں اس بات سے ذرا ڈر نہیں لگتا کہ میں ایک جلاوطن ہوں؟ ایک مجرم ہوں؟''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلا دیا۔

''یا یہ کہ تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں؟''

''اب اتنے بڑے بھی نہیں!''

''یا یہ کہ مریض ہوں؟''

اُس نے اپنی پیشانی الیگ کی چھاتی پر رکھ دی۔

اس نے زویا کو اپنے سے اور قریب کھینچ لیا اور ان گرم، بیضوی ابھاروں کو محسوس کیا ـــــ اگر ان پر فشار رکھا جائے تو کیا پھسل پڑے گا؟ ـــــ اور بولا:

''تو کیا تم سچ مچ میرے ساتھ اُشترک (Ush-Terek) چلو گی؟ ہم شادی کرلیں گے۔ وہاں اپنا گھر بسائیں گے۔''

یہ ساری باتیں زویا کو وہ ''تسلسل'' عطا کرنے کا وعدہ کر رہی تھیں جو اس کی زندگی میں مفقود تھا، وہ تسلسل جو شہد کی مکھی ہونے کے ناتے اس کی فطرت کا تقاضا تھا، وہ قابلِ اعتماد اور تخلیقی تسلسل جو

ملبوسات کو کمرے میں منتشر کرنے کے بعد آنے والا تھا۔ اس کے جسم سے پیوست، زویا نے سوچا: تو کیا یہ وہی آدمی تھا؟ کیا قدرت نے اس آدمی کا انتخاب کیا تھا جو اسے ۔۔۔؟

وہ پنجوں کے بل اٹھی اور اپنا بازو اس کے گردن کے گرد حمائل کر دیا۔

''الیا ژوک!'' اس نے الیک کو پیار کے نام سے مخاطب کیا۔ ''تمھیں پتا ہے یہ انجیکشن کیا اثر کرتے ہیں؟''

''کیا اثر کرتے ہیں؟'' اس کے رخسار پر عجیب سی تختی اُمڈ آئی۔

''یہ انجیکشن ... کیسے بتاؤں؟ ... انھیں ہورمون تھیراپی کہتے ہیں۔ یعنی الٹے ہورمون دیے جاتے ہیں: مرد کو عورت کے، عورت کو مرد کے۔ قیاس ہے کہ اس علاج سے سرطان کے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیلنے کا عمل دب جاتا ہے، لیکن اگر یہ کچھ دباتے ہیں تو غالب طور پر ... تم سمجھ گئے ہو گے؟''

''کیا؟ نہیں۔ پوری طرح سے نہیں،'' الیک کو جیسے بچھو ڈنک مار گیا ہو، اور وہ تڑق کر بولا۔ اب اس نے زویا کو ایک بالکل مختلف انداز میں شانوں سے تھاما ہوا تھا، گویا وہ انھیں ہلا ہلا کر اس سے پوری حقیقت اگلوانے کے درپے ہو۔ ''بتاؤ۔ صاف صاف بتاؤ!''

''یہ دباتا ہے تو ۔۔۔ اچھا خیر ۔۔۔ جنسی صلاحیت کو۔ اور یہ باقی خصائص کی تبدیلی سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ اگر عورت کو مرد کے ہورمون زیادہ مقدار میں دیے جائیں تو، میرا مطلب ہے اس کے باقاعدہ داڑھی نکل سکتی ہے۔ اور مرد کے باقاعدہ پستان۔''

''ٹھہرو! تم آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟'' الیک جس کی سمجھ میں بات بس اب کچھ کچھ آنے لگی تھی، چنگھاڑا۔ ''یہ انجیکشن؟ یہ جو مجھے دیے جا رہے ہیں؟ ہاں تو ان کا کیا اثر ہوتا ہے؟ 'ہر چیز' کو دبا دیتے ہیں؟''

''نہیں بھئی، ہر چیز کو نہیں۔ لی بائی ڈو بہت بعد تک بھی باقی رہتی ہے۔''

''لی بائی ڈو ۔۔۔ یہ کیا ہوتی ہے؟''

زویا نے ٹھیک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بے حد نرمی سے اس کی سامنے کی لٹوں کو تھپتھپایا:

''وہی جو اس وقت تم میرے لیے محسوس کر رہے ہو: خواہش۔''

''تو خواہش باقی رہتی ہے لیکن صلاحیت جاتی رہتی ہے؟ بس یہی کہنا چاہتی ہو؟'' اس نے دہل کر پوچھا۔

''صلاحیت ماند پڑتی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ خواہش بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ سمجھے؟'' اس نے الیگ کے زخم کے گرد انگلی پھرائی اور اس کا گال تھپتھپایا۔ ''میں اسی لیے تو تمھیں یہ انجیکشن نہیں لگانا چاہتی۔''

''واہ— کیا— کہنے!'' الیگ نے اپنے حواس مجتمع کیے اور سیدھا ہو گیا۔ ''ماشاء اللہ... کیا نفیس صورت حال ہے! میرا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے گمان تھا کہ بس اسی قسم کا کوئی داؤ پیچ مجھ پر استعمال کیا جائے گا۔ اور ٹھیک یہی ہو بھی رہا ہے، سوفی صد!''

وہ ڈاکٹروں کو... سارے ڈاکٹروں کو کوسنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں میں دانستہ دخل اندازی کر کے انھیں کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں... معاً اسے گنگارت کا اعتماد سے دمکتا ہوا چہرہ یاد آ گیا۔ کل، جب اس نے اس کی طرف اس قدر دوستانہ اور مشتاق کریم نفسی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا: ''تمھاری زندگی کے لیے بے حد ضروری! تمھاری زندگی ہمیں بہر قیمت بچانی ہے!''

تو یہ ویگا (Vega) تھی! اس کی بہتری کی خواہاں— وہ بہتری جس کے حصول کے واسطے اسے الیگ کو دھوکا دے کر بدبختی تک پہنچا دینے میں کوئی عار نہ ہوتا۔

''تو کیا تم بھی ویسی ہی نکلو گی!'' الیگ نے آنکھ سکیڑ کر زویا کی طرف دیکھا۔ ''مدرسے میں تعلیم دی جاتی ہے، 'زندگی آدمی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے؛ وہ صرف ایک مرتبہ ہی جیتا ہے'؛ چنانچہ، زندگی سے بہر قیمت چمٹے رہو— یہی کہنا چاہتی ہو نا؟''

لیکن زویا کو قصوروار ٹھہرانے کی بھلا کیا تک ہے؟ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ جو کچھ بھی تھا، زویا اس سے متفق تھی: ''اس چیز'' کے بغیر زندہ رہا ہی کیوں جائے؟ اپنے ہونٹوں کی محض طمع اور حدت ہی سے اس نے آج الیگ کو کوہِ قفقاز کے اس پار پہنچا دیا تھا۔ وہ یہاں، ٹھیک اس کے سامنے کھڑی ہے، اس کے ہونٹ بھی سامنے ہیں۔ اور جب تک یہ لی بائی ڈو اس کی رانوں اور پیڑو میں موج زن ہے، اسے جلدی کرنی چاہیے اور ان ہونٹوں کو چوم لینا چاہیے۔

''مجھے الٹے انجیکشن نہیں دے سکتیں؟''

''اِس جرم کی پاداش میں لات مار کر مجھے یہاں سے نکال دیں گے۔''

''الٹ انجیکشن بھی ہوتے ہیں — ہیں نا؟''

''یہی والے ہوتے ہیں، بس دوسرے سرے سے لگائے جاتے ہیں: مردانہ ہورمون کے مردوں کو، اور زنانہ ہورمون کے عورتوں کو۔''

''سنو، سنہری زلف، چلو کہیں چلیں...''

''یہ 'کہیں' ہی تو ہے۔ ہم یہاں ہیں۔ اور اب ہمیں لوٹنا ہے۔''

''چلو ڈاکٹروں کے کمرے میں چلیں...''

''نہ، وہاں نہیں جا سکتے۔ وہاں اردلی ہوتا ہے۔ پھر لوگ بھی مسلسل آتے جاتے رہتے ہیں... بعد میں، رات ہو جائے گی نا تب۔''

''خیر، لیکن آج رات ہی۔''

''اتنی بے صبری کس لیے، الیا ژوک! کل کے لیے کچھ تو اٹھا رکھو۔''

''کون سا کل، اگر کل تک میری لی بائی ڈو ہی چمپت ہو چکی ہو تو؟ یا، بدتر یہ کہ، شکر یہ، میری لی بائی ڈو تو صحیح سلامت ہے لیکن... کوئی جگہ ضرور ڈھونڈ نکالو۔ چلو چلیں۔''

''الیا ژوک، ہمیں کچھ ضرور بچا رکھنا چاہیے تا کہ آرزو مندی سے اس کا انتظار کر سکیں... جلد بازی مت کرو!... آکسیجن کا تھیلا بھی تو لے کر جانا ہے...''

''خیر وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی، فوراً...''

بالکل۔ ابھی، فوراً۔''

''ٹھ۔ ٹھ۔ ٹھیک... ابھی — فوراً۔''

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں نے ہاتھ نہیں تھامے، بس آکسیجن کا تھیلا پکڑے رہے جو فٹ بال کی طرح پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ ہاتھ تھامنے کی ضرورت بھی کیا تھی، کیونکہ ایک دوسرے کی خفیف ترین لرزش بھی تھیلے سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچ رہی تھی۔

زینے کی لینڈنگ، جہاں سے سارا دن اور ساری رات صحت مند اور بیمار دونوں ہی طرح کے

لوگ اپنے اپنے دھندوں، اپنی اپنی فکروں میں غلطاں گزرتے رہتے تھے، وہ زرد رو، سکڑا کمھلایا ہوا، کمزور سینہ آدمی اپنے تکیوں میں دھنسا بیٹھا تھا۔ وہ اب کھانس وانس بھی نہیں رہا تھا، بس اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر سر دائیں بائیں جھلا رہا تھا، یا ممکن ہے اپنی بھنوؤں سے اپنے گھٹنوں کو سر کے گرد کھنچی ہوئی کسی دیوار کی طرح محسوس کر رہا تھا۔

وہ ہنوز زندہ تھا، لیکن اس کے ارد گرد دور دور تک کسی متنفس کا پتا نہ تھا۔

شاید وہ اسی دن مرنے والا ہو ــــ ایک کا بھائی، ایک ہی کی طرح کا انسان، جس کا ساتھ چھوڑ دیا گیا ہو، ہمدردی کا بھوکا۔ اگر ایک اس کے بستر کے پاس بیٹھ گیا ہوتا، یہاں رات گزاردی ہوتی، تو ممکن تھا یہ آخری گھڑیاں اس شخص پر اتنی گراں نہ گزرتیں۔

لیکن دونوں نے بس اتنا ہی کیا کہ آکسیجن کا تھیلا اس کے ہاتھوں میں تھمادیا اور آگے بڑھ گئے۔ تھیلے میں اس گردن زدنی آدمی، اس ختم ہوتے ہوئے مریض، کی سانسوں کے آخری مربع سینٹی میٹر تھے: تاہم جو اِن دونوں کے واسطے تنہائی میں ہم آغوش ہونے اور بوسے دینے لینے کا ایک بہانہ تھا۔

ایک اور زویا زینے پر یوں ساتھ ساتھ چڑھنے لگے جیسے ایک دوسرے سے بندھے ہوں۔ پیچھے ایک نے اس آدمی کی بابت کچھ نہ سوچا جسے فنا کا حکم مل چکا تھا، کیونکہ بمشکل ہفتہ عشرہ پہلے وہ خود اپنی سزائے موت سن چکا تھا، یا جیسا کہ چھ ماہ کے بعد پھر سننے والا تھا، بلکہ کچھ سوچا تو صرف اپنے سامنے موجود اس لڑکی، اس عورت، اس مؤنث کے بارے میں ہی، اور اس کے بارے میں کہ وہ اُسے کس طرح اپنے ساتھ اکیلی چلے آنے پر آمادہ کرسکتا ہے۔

اسے ایک بار پھر زمانوں کا بھلایا ہوا، اور اسی وجہ سے کچھ اور زیادہ غیر متوقع، دکھتا ہوا لمس محسوس ہوا، ان لبوں کا لمس جنھیں برسوں کی یورش نے اتنا متورم کر دیا ہو کہ کھردرے لگنے لگیں۔ اور پھر ہیجان کی یہ لہر اس کے پورے جسم سے شباب کے ہیجان کی طرح سرسراتی ہوئی گزر گئی۔

❋

الیگزاندر سولژے نیتسن

بوالعجبی ہی بوالعجبی

❊

لیف لیانی دووچ(Lev Leonidovich) کے اسپتال میں آتے ہی کستا گلوتف(Kostoglotov) نے جھٹ پٹ فیصلہ کر ڈالا کہ لو بھئی ایک ہوشمند تو آیا۔ جب لیف لیانی دووچ مریضوں کے معائنے کے واسطے نکلا تو گشت کی پوری مدت کستا گلوتف، چونکہ بے کار بیٹھا تھا، اسے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ سرجنوں والی ٹوپی، جو آئینے کا منت کش ہوئے بغیر ہی سر پر منڈھ لی گئی تھی؛ غیر معمولی لمبے بازو، مٹھیاں گاؤن کی سامنے والی جیبوں میں ٹھنسی ہوئی؛ ہونٹوں کو ایک طرف کھینچنے کا مخصوص انداز، جیسے سیٹی بجانا چاہتا ہو؛ اپنے دم خم اور گمبھیرتا کے باوجود مریضوں سے ہلکی پھلکی مزاحیہ گفتگو کا اس کا انداز ــــ ان سب باتوں نے کستا گلوتف کو اس کی طرف مائل کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کے ساتھ باتیں کرے، متعدد ایسے سوال کرے، جن کا جواب یہاں کئی زنانہ ڈاکٹروں میں سے کوئی بھی تو نہ دینا چاہتی تھی، نہ دینے پر قادر تھی۔

لیکن اپنا سوال پیش کرنا اب اتنا آسان بھی نہ تھا۔ جب لیف لیانی دووچ معائنے پر نکلتا تو صرف سرجری والے مریضوں ہی کو قابلِ اعتنا سمجھتا اور دوسروں کو بالکل نظر انداز کر جاتا۔ اور ان مریضوں کے پاس سے تو، جن کا علاج ایکس ریز کے ذریعے ہو رہا ہو، وہ یوں گزر جاتا جیسے وہ وہاں بھلا کاہے کو موجود ہوں۔ راہداریوں میں یا زینے پر وہ کبھی سلام کرنے والوں کو بے حد مختصر سا جواب دیتا۔ تاہم جو فکریں اسے گھیرے ہوئے ہوتیں، کبھی چہرے سے جدا نہ ہوتیں، اور وہ ہمیشہ ہی بڑی جلدی میں نظر آتا۔

ایک بار جب اسے بتایا گیا کہ ایک مریض پہلے تو نہ نہ کرتا رہا لیکن پھر بعد میں اس نے بات کا اعتراف کر ہی لیا، تو اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا: ''تو بالآخر انھوں نے گھٹنے ٹکوا ہی لیے!'' اس بات نے الیگ(Oleg) کے تجسس کو مزید ہوا دی۔ کیونکہ وہ فقرہ ایسا نہیں تھا جس سے ہر آدمی واقف ہو، یا ہو تو اس [خاص] مفہوم میں استعمال بھی کر سکے۔

''کینسر وارڈ''(*Cancer Ward*) کا اٹھائیسواں باب: "Odd Numbers Everywhere"

کستاگلوتف کی درونِ اسپتال مٹرگشت میں اب خاصی کمی آ گئی تھی اور یہ اتفاق کم ہی ہوتا تھا کہ سرجن اعلیٰ سے کہیں راستے میں مڈبھیڑ ہو جائے۔ تاہم ایک مرتبہ اس نے لیف لیانی دووچ کو آپریشن کے کمرے کے برابر اپنے چھوٹے سے دفتر کا تالا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس وقت وہ وہاں بالکل اکیلا ہوگا۔ کستاگلوتف نے سفید رنگ چڑھے شیشے پر دستک دی اور دروازہ کھولا۔

لیف لیانی دووچ اس اثنا میں کمرے کے وسط میں پڑی تنہا ڈیسک کے پیچھے ایک پستہ قد اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ پہلو کے رخ بیٹھا ہوا تھا جیسے آدمی اس وقت بیٹھتا ہے جب عجلت میں ہو، اور اب اس نے کچھ لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے سر اٹھا دیا۔ وہ ذرا متعجب نہیں دکھائی دے رہا تھا، بس پہلے کی طرح منہمک تھا، جیسے اس فکر میں ڈوبا ہوا ہو کہ اب اگلا لفظ کیا ہونا چاہیے۔

جسے دیکھو ہر وقت بری طرح مشغول نظر آتا ہے جیسے پوری زندگی کا فیصلہ ایک آدھ منٹ میں ہی تو کرنا ہو۔

''معاف کیجیے گا، لیف لیانی دووچ،'' کستاگلوتف نے بکمال شائستگی بات کرنے کی کوشش کی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ مصروف ہیں، لیکن آپ کے علاوہ کوئی اور موجود بھی نہیں۔ کیا مجھے دو منٹ دے سکتے ہیں؟''

سرجن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور طرف لگا ہوا ہے۔

''میرے... کا علاج ہورمون کے ذریعے شروع ہو گیا ہے... سنسٹرال (sinestrol) کے انجکشن میرے پٹھوں میں لگائے جا رہے ہیں... اور مقدار ہے...'' (کستاگلوتف ڈاکٹروں سے انھیں کی زبان میں بات کرنا پسند کرتا تھا۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر بالکل صحیح صحیح اور نپا تلا ــــ اور اس پر اسے فخر بھی تھا۔ یہ ان کے ساتھ کھری کھری گفتگو کے سوانگ کا ایک انداز تھا۔) ''خیر، تو اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہورمون طریقۂ علاج کا اثر مجموعی ہوتا ہے یا نہیں؟''

اس افتتاحی جملے پر ان ایک سو بیس سیکنڈوں میں سے، جن کی اس نے فرمائش کی تھی، پورے بیس سیکنڈ کھپ گئے۔ اس کے بعد سیکنڈوں کے گزرنے کا انحصار اس پر نہیں رہا تھا۔ وہ پیچھے ہاتھ باندھے

کھڑا رہا اور نیچے کی طرف نشستہ آدمی کو دیکھنے لگا، ذرا سا آگے کو جھک کر، اپنی بالا قدی کے تھوڑے بہت ازالے کے طور پر۔

لیف لیانی دووچ کی پیشانی شکن آلود ہوگئی اور اس نے پہلو بدلا۔

''نہیں بھئی، مجموعی[1] خیال تو نہیں کیا جاتا۔'' لیکن جواب میں قطعیت کی کمی صاف ظاہر تھی۔

''پتا نہیں کیوں، مجھے تو یہی لگتا ہے جیسے مجموعی ہو،'' کستا گلوتف اڑا رہا، جیسے کہ چاہتا ہو اثر مجموعی ہی ہو، یا یہ نہیں تو پھر لیف لیانی دووچ پر یقین نہ آ رہا ہو۔

''ارے نہیں۔ ہونا تو نہیں چاہیے،'' سرجن بولا، لیکن اس بار بھی اتنی ہی ڈھل مل یقینی سے، شاید اس لیے کہ یہ اس کا اصلی میدان نہ رہا ہو، یا اسے سوال پر پوری توجہ دینے میں مشکل ہو رہی ہو۔

''میرے لیے یہ جاننا بے حد ضروری ہے،'' کستا گلوتف نے سرجن کی طرف دیکھ کر کچھ اس طرح کہا جیسے اسے دھمکی دے رہا ہو۔ ''اس معالجے کے بعد کیا میں بالکل قابل نہیں رہوں گا... میرا مطلب ہے... عورتوں کے... یا یہ صورت عارضی ہوگی؟ اگر ہورمون ایک دفعہ میرے جسم میں داخل کر دیے گئے، تو پھر یہ کبھی خارج بھی ہو سکیں گے؟ یا ہمیشہ وہیں پڑے رہیں گے؟ کیا علاج کی مدت ختم ہونے پر اس ہورمون تھیراپی کا رخ پلٹا جا سکتا ہے — میرا مطلب ہے مخالف ہورمون کے انجکشن دے کر؟''

''نہیں۔ یہ مشورہ تو میں تمھیں کبھی نہیں دوں گا۔ یہ تمھیں ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔'' لیف لیانی دووچ نے اس لمبے بالوں والے مریض کو دیکھا، لیکن اس کی نظریں دراصل مریض کے دلچسپ زخم ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے تصور ہی تصور میں سوچا کہ جب اسے جراحت کے لیے لایا گیا ہوگا تو کاٹ کا تازہ تازہ نشان کیسا لگ رہا ہوگا، اور اسے بند کر کے سینے میں کیا کچھ کارگزاری کرنی پڑی ہوگی۔ ''مگر تمھیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

''کیا سمجھ میں نہیں آتا؟'' کستا گلوتف سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ سرجن کی سمجھ میں کیا نہیں آ رہا تھا۔ یہ باہوش آدمی، تو کیا یہ اپنے طبی پیشے سے محض وفاداری کے ثبوت کے طور پر دوسرے تمام ڈاکٹروں کی طرح یہی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نہ کسی حیلے سے مریض کے گھٹنے ٹکوا لے؟ ''کیا آپ واقعی نہیں سمجھتے؟''

۱۔ ''مجموعی'' سے کام چل جائے تو ٹھیک، ورنہ "cumulative" حاضر ہے۔

معاملہ دومنٹوں سے آگے نکل چکا تھا، یہی نہیں بلکہ معالج اور مریض کے رشتے سے آگے بھی۔
تاہم لیف لیانی دووچ اسی بے تصنع، اسی بے ادعا انداز میں ـــ جو کستا گلوتف نے اس میں دریافت کرلیا تھا، اور جو اسے شروع ہی سے بڑا بھلا لگا تھا ـــ نرمی سے اور نہایت غیر پیشہ ورانہ طور پر یوں بولا جیسے کسی دیرینہ دوست سے مخاطب ہو۔

''سنو۔ زندگی میں صرف عورتیں ہی پرکشش نہیں ہوتیں۔ آدمی ان باتوں سے بری طرح اکتا بھی جاتا ہے۔ پھر یہ ان چیزوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں جو واقعی اہم ہوتی ہیں۔'' لیف لیانی دووچ نے بڑے اخلاص، حتی کہ بڑی بیزاری سے کہا۔ اسے یاد آیا کہ اپنی زندگی کے اہم ترین لمحے میں وہ خود حسبِ ضرورت کوشش سے عاجز رہا تھا، جس کا باعث اس کی توانائی پر شاید یہی خلل انداز مطالبہ رہا ہو۔
کستا گلوتف، بہر حال، اس کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہا۔ جہاں تک الیک کا تعلق ہے، تو وہ اس قسم کے احساس سے اکتا جانے والی اسامی نہیں تھا۔ اس نے اپنا سر دائیں بائیں جھٹکا، اور خالی خالی آنکھوں سے گھورنے لگا:

''اس کے علاوہ کوئی اور 'اہم' چیز میری زندگی میں باقی نہیں رہی۔''

اس قسم کی گفتگو ''اونکولوجیکل وارڈ'' کے ضابطے میں داخل نہ تھی۔ زندگی کی معنویت پر مباحثے کے واسطے ڈاکٹروں سے چارہ جوئی ـــ اور وہ بھی ایک بالکل مختلف شعبے کے ڈاکٹر سے ـــ کسی گوشوارے میں داخل نہ تھی۔ ایک منحنی سی، نازک اندام، نوجوان زنانہ سرجن نے دفتر میں جھانک کر دیکھا اور پھر اپنے اونچی ایڑی والے جوتوں پر جھولتی ہوئی فوراً ہی اندر داخل ہوگئی۔ ادنیٰ سی پس وپیش کا مظاہرہ کیے بغیر، وہ سیدھی لیف لیانی دووچ کی طرف بڑھی، تقریباً اس کے سر پر جا سوار ہوئی، ایک لیبارٹری رپورٹ ڈیسک پر اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے جھکی (جس فاصلے پر الیک کھڑا تھا وہاں سے اسے بالکل ایسا لگا گویا وہ لیف لیانی دووچ کے جسم سے جسم بھڑائے جھکی ہوئی تھی)، اور اس کا نام یا خطاب لیے بغیر ہی اس سے بولی:

''دیکھو اودینکو (Ovdienko) کے خون میں لوکوسائٹس (leucocytes) کا شمار بیس ہزار تک پہنچ گیا ہے۔''

اس کے ہوا میں لہراتے سرخ بالوں کا لطیف سا گچھا ٹھیک لیف لیانی دووچ کے چہرے کے

سامنے منڈلانے لگا۔

"تو کیا ہوا؟" لیف لیانی دووچ نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "اس سے لیوکوسائٹوسس (leucocytosis) کے بڑھنے کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ بس یہی کہ سوجن بڑھ گئی ہے۔ اس کی روک تھام ایکس ریز کے ذریعے کرنی ہوگی۔"

مگر وہ دھڑا دھڑ بولے گئی (الیک کا خیال صحیح تھا، وہ اپنا شانہ ٹھیک لیف لیانی دووچ کے بازو سے بھڑائے کھڑی تھی)۔ وہ کاغذ جس پر لیف لیانی دووچ نے کچھ لکھنا شروع کیا تھا، یونہی بے کار پڑا رہا، اور وہ قلم کو انگلیوں میں بے مصرف گردش دینے لگا۔

ظاہراً اب الیک کو وہاں سے اٹھ کر چلا جانا چاہیے تھا۔ لیکن بیچ سے بات کا یوں کٹ جانا اسے سخت ناگوار گزرا، خاص طور پر اس لیے کہ وہ ایک مدت سے اس موقعے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس لیے بھی کہ گفتگو اب نہایت دلچسپ مقام پر آ پہنچی تھی۔

انجلینا (Angelina) ایک دم پلٹی، اور پھر یہ دیکھ کر کہ کستاگلوتف ہنوز وہیں جما ہوا ہے، بری طرح چونک پڑی۔ لیکن اس کے سر سے اوپر الیک کو لیف لیانی دووچ کا چہرہ نظر آیا اور آنکھوں میں شرارت کی دبی دبی سی جھلک۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی ناقابلِ بیان کیفیت تھی جس سے مجبور ہو کر کستاگلوتف نے اپنی بات جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا:

"لیف لیانی دووچ، میں ایک بات اور پوچھنا چاہتا تھا: کیا آپ نے برچ کے درخت کی چھال پر اگنے والی کھمبی کے بارے میں سنا ہے جسے چھاگا (chaga) کہتے ہیں؟"

"ہاں، کیوں نہیں،" لیف لیانی دووچ نے بخوشی جواب دیا۔

"تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کہنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض مقامی[1] قسم کی رسولیوں پر یہ کارگر ہوتا ہے، مثلاً جیسے پیٹ کی رسولی۔ ماسکو میں خلقت چھاگا کے پیچھے دیوانی ہوئی جارہی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ماسکو کے گردونواح کے جنگلوں میں سو میل تک لوگوں نے ایک چھاگا بھی باقی نہیں رہنے دیا ہے۔"

انجلینا ایک دم تیر کی طرح سیدھی ہوگئی، اپنی لیبارٹری رپورٹ اٹھائی، اور ناگواری کا تاثر لیے

۱۔ local: یعنی ایسا سرطان جو جسم کے کسی خاص مقام یا عضو تک محدود ہو۔

وہاں سے چلتی بنی، اس بار بھی بکمالِ آزادی (اور اتنے ہی پر کشش انداز میں) کولھے مٹکاتی ہوئی۔

وہ جا چکی تھی، لیکن — آہ! — اس کی گفتگو میں خلل پڑ چکا تھا: اسے اپنے سوالوں کا کچھ نہ کچھ جواب مل ہی چکا تھا۔ ظاہر ہے گفتگو کو پھر سے اس موضوع پر لانا کہ عورتیں مرد کی زندگی میں کیا اضافہ کرنے کی اہل ہوتی ہیں، اب خاصا بے ڈھب ہوتا۔

تاہم اس لطیف، خوش باش چمک نے جو لیف لیانی دووچ کی آنکھوں میں بجلی کی طرح کوند گئی تھی، ساتھ ہی ساتھ اس کی بے تکلفی نے، کستاگلوتف کو ایک تیسرا سوال پوچھنے کی جرأت دلا دی: یہ سوال بھی وہ پہلے سے تیار کر کے لایا تھا، اور یہ بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔

''لیف لیانی دووچ، براہِ کرم میرے گنوار پن کو نظر انداز کریں،'' اس نے سر کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے ابتدا کی، ''اور اگر مجھ سے پہچاننے میں غلطی ہو رہی ہو تو کچھ خیال نہ فرمائیں، مگر کیا آپ...'' اس نے آواز بہت نیچے گرا دی اور آنکھ مار کے کہا، ''... کیا آپ... کبھی وہاں ہوا کرتے تھے جہاں لوگ ہمیشہ رنگ رلیاں مناتے ہیں: گانے بجاتے اور رقص کرتے ہیں؟''

زندگی کی ایک پر جوش، گرم لہر لیف لیانی دووچ کے جسم میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔

''ہاں۔''

''واہ، کیسے پتا تھا!'' کستاگلوتف مسرت کے مارے چیخ پڑا۔ تو کیا ایک وقت ایسا بھی رہا تھا جب وہ ایک دوسرے کے ہمسر رہ چکے تھے! ''آپ پر کس چیز کا الزام تھا؟''

''کسی چیز کا بھی نہیں۔ بھئی میں بالکل آزاد تھا۔''

''اچھا، آزاد!'' کستاگلوتف مایوس ہو گیا۔

نہیں، وہ ایک دوسرے کے ہمسر نہیں رہ چکے تھے۔

''لیکن تم نے کیسے اندازہ کر لیا؟''

''آپ نے ایک بار یہ فقرہ استعمال کیا تھا، 'تو بالآخر انھوں نے گھٹنے ٹکوا ہی لیے۔' ایک اور بار، یاد آتا ہے، آپ نے 'کیمپ وائف' کی ترکیب بھی استعمال کی تھی۔''

لیف لیانی دووچ ہنس پڑا۔ ''بس ایک طرزِ تکلم سمجھو، اور کیا!''

ہمسر رہ چکے تھے یا نہیں ــــ لیکن اب، پہلے کے مقابلے میں دونوں میں بہت کچھ مشترک تھا۔

''کیا آپ کو وہاں بڑی مدت تک رہنا پڑا تھا؟'' کستاگلوتف نے بے تکلفی سے پوچھا۔ اور یہی نہیں، تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا، اور تو اور اس کی آنکھوں سے ہار جانے کا وہ پچھلا تاثر بھی رخصت ہو چکا تھا۔

''تین سال تک۔ فوج میں ملازمت کی میعاد پوری کرنے کے بعد مجھے وہاں تعینات کر دیا گیا۔ اس تقرر سے جان نہیں چھڑا سکا۔''

اسے اس آخری بات کے اضافے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، تاہم کر ہی دیا۔ ظاہر ہے، اس کا پیشہ ڈاکٹر کا تھا: باعزت، شریفانہ: یہ کیا بات ہوئی کہ باعزت لوگ اسے اختیار کرنے کا جواز بھی مہیا کرتے پھریں۔ آدمی کے اندر کہیں کردار کا یہ انمٹ نُھپا ضرور چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔

''آپ کے ذمے کیا کام تھا؟''

''میں ایک کیمپ کے طبی دستے کا سربراہ تھا۔''

اوہو! عین مین مادام دوبنسکیا (Dubinskaya) کی طرح، مالکِ موت و زیست۔ لیکن مادام دوبنسکیا نے ایسا کوئی جواب مہیا کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی، پھر یہ بھی کہ اب وہ، بہر حال، وہاں سے جا چکا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں تعلیم مکمل کر لی تھی۔'' کستاگلوتف کسی خاردار جھاڑی [سنے] کی طرح چمٹا رہا۔ لیکن یہ اصرار اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس کے لیے لیف لیانی دووچ کے بارے میں سب کچھ جان لینا واقعی بے حد ضروری ہو۔ یہ تو محض قیدی کی وہ عادت تھی جس کے ذریعے وہ ان چند ثانیوں میں ــــ جو دروازہ کھولنے، کھانا اندر سرکانے، اور دروازہ پھر سے مقفل کر دینے میں لگتے ہیں ــــ ایک مکمل اجنبی کی پوری زندگی کو جذب کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ ''آپ کی کیا عمر ہوگی؟''

''ارے نہیں بھئی، میں نے چوتھا سال ختم کرنے کے بعد، تکمیلی سرٹیفکیٹ ملنے کا انتظار کیے بغیر ہی، فوج میں طبی خدمت کے واسطے اپنے کو رضاکارانہ پیش کر دیا تھا۔'' لیف لیانی دووچ نے قلم رکھ دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا، اور چلتا ہوا الیک کے پاس آیا۔ اس کی انگلیاں آگے بڑھیں اور الیک کے زخم کو ہولے

ہو لے تھپتھپانے لگیں، جو اسے بڑا پرکشش لگا۔ ''کیا یہ 'وہیں' کی دین ہے؟''

''اونھ ہوں۔''

''لگتا ہے کسی نے بڑی مہارت سے اسے بند کر کے سیا ہے۔ بڑی مہارت سے۔ کیا ڈاکٹر خود کوئی قیدی ویدی تھا؟''

''اونھ ہوں۔''

''اس کا نام یاد ہے؟ کریاکوف (Koryakov) تو نہیں؟''

''پتا نہیں۔ وہ ایک ٹرانزٹ کیمپ تھا۔ یہ کریاکوف — یہ وہاں کس جرم کی سزا بھگت رہا تھا؟''

الیک، کریاکوف کے نام سے جونک کی طرح چمٹ چکا تھا، اس کی زندگی میں اتر چکا تھا۔

''اس جرم کی کہ اس کا باپ زار کی فوج میں کرنل ہوا کرتا تھا۔''

لیکن ٹھیک اسی لمحے جاپانی آنکھوں والی نرس سر پر سفید تاج جمائے داخل ہوئی اور لیف لیانی دوودچ کو مرہم پٹی والے کمرے میں آنے کے لیے کہا۔

کستاگلوتف کے شانے پھر سے بے جان ہو کر ڈھلک گئے، اور وہ راہداری میں گھومتا پھرتا نکل گیا۔

ایک اور سوانح عمری خاکے کی صورت میں۔ بلکہ دو۔ گمشدہ کڑیاں اس کا تخیل خود بہم پہنچا سکتا تھا۔ لوگ کن کن اور کیسے کیسے راستوں سے ہو کر انجام کار ''وہاں'' آ ہی پہنچتے تھے۔ نہیں، بات یہ نہیں تھی، بلکہ یہ تھی کہ آپ وارڈ میں اپنے پلنگ پر پڑے ہوتے ہیں، آپ راہداری میں چلتے پھرتے ہیں، باغ میں چہل قدمی کرتے ہیں، کہ آپ کے پہلو بہ پہلو، یا آپ کی سمت میں، ایک آدمی، کوئی بھی آدمی، آ رہا ہوتا ہے؛ نہ آپ کو، نہ اس آدمی کو ہی، کبھی بھول کر یہ خیال آتا ہے کہ منٹ دو منٹ کے لیے رک جائے، اور دوسرے سے پوچھتا چلے: ''اپنی جیکٹ کے بٹن کھولو۔ ذرا دیکھیں تو سہی اندر ہے کیا!'' اور یوں ہوتا ہے کہ آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہوتا ہے: وہ خفیہ برادری کا امتیازی نشان لگائے ہوتا ہے! — یہ وہاں ہو آیا ہے، اس میں معاون رہ چکا ہے، اس کے بارے میں جانتا ہے۔ ایسے کتنے ہی تھے! لیکن خاموشی نے انھیں جکڑا ہوا تھا۔ اور ان میں سے کسی بھی بات کا محض آدمی کے حلیے بشرے سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ کتنی مہارت سے چھپائی گئی تھی۔

یا عجب: کیسے باور کرلیا جائے کہ عورتیں صرف ایک آزار ہی ہوتی ہیں! کیسے مان لیا جائے کہ آدمی عورت سے اتنا سیر بھی ہوسکتا ہے! اس کا تو قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سب مل ملا کر، اسے لگا کہ یہ جشنِ مسرت منانے کا تو کوئی موقع نہیں۔ لیف لیانی دووچ کا انکار اتنا قطعی نہیں تھا کہ وہ اس پر من وعن یقین کر لیتا۔

اسے اس احساس کو قبول کرنا ہی پڑا کہ وہ سب کچھ ہار چکا ہے — سب کچھ۔ سب کچھ۔

یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ آسمان سے ٹپکا کھجور میں اٹکا! کستا گلوتف کو دیدگاہ سے کیا اس لیے نجات ملی تھی کہ طولِ عمر کی سزا کاٹے: وہ زندہ ضرور تھا، لیکن کیوں اور کس لیے، یہ اسے معلوم نہ تھا۔

آپریشن کے کمرے سے ملحق دفتر سے نکلنے کے بعد وہ کسی خاص جگہ جانے کے ارادے سے چل پڑا تھا؛ لیکن اب بالکل بھول چکا تھا کہ کہاں۔ اس نے دیکھا تو زیریں منزل کی راہداری میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیر تک وہاں یوں ہی بے مصرف کھڑا رہا۔

راہداری میں آگے کی جانب تیسرا دروازہ کھلا اور ایک سفید گاؤن برآمد ہوا، تنگ کمر، اور شناسا سا۔

وے گا (Vega)!

وہ اسی کی طرف آ رہی تھی۔ ان کے درمیان مختصر سا فاصلہ تھا: ویگا کو بس دو پلنگوں کے گرد گھومنے کی دیر تھی جو دیوار کے سہارے پڑے ہوئے تھے۔ ایک نے اس کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ اس کے پاس ایک، دو، تین سیکنڈ تھے۔ انھیں میں اسے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا تھا۔

ویگا کو گشت پر نکلے پورے تین دن ہو رہے تھے، تین دن جن میں کستا گلوتف کی طرف اس کا رویہ سرد اور کاروباری رہا تھا؛ اس نے ایک بار بھی تو اس کی طرف دوستانہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔

پہلے اس نے سوچا: بھاڑ میں جائے۔ وہ بھی اس کے ساتھ بالکل اسی طرح پیش آئے گا جس طرح وہ پیش آ رہی تھی۔ وہ اس کے طرزِ عمل کی تاویل کرنے نہیں بیٹھ جائے گا، اپنے کو سبک سر نہیں ہونے دے گا!

تاہم وہ متاسف تھا۔ ویگا کو تکلیف پہنچاتے ہوئے اسے افسوس ہو رہا تھا۔ اور افسوس تو اسے خود اپنے پر بھی تھا۔ تو کیا ٹھیک ابھی — وہ ایک دوسرے کے برابر سے کامل اجنبیوں کی طرح گزر جائیں گے؟

کیا وہ قصوروار تھا؟ قصوروار تو وہ خود تھی: اس نے کستا گلوتف کو انجیکشنوں کے بارے میں دھوکا دیا تھا، وہ اس کا برا چاہتی تھی۔ اس بات پر وہ اسے کبھی معاف نہیں کرسکتا!

ایک دوسرے کی طرف نظریں اٹھائے بغیر، (تاہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے،) وہ برابر آئے، اور ایک، اپنے ارادے کے بالکل الٹ، ملائمیت سے اعتذار امنمنا دیا:

''ویرا کرنی لیونا... (Vera Karnilyevna)''

(لہجہ سخت مضحکہ خیز تھا، تاہم اسے مسرت محسوس ہوئی۔)

اس نے اپنی بے مہر آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

(وہ اسے کیوں معاف کیے دے رہا ہے؟)

''...ویرا کرنی لیونا... کیا آپ مجھے ایک اور بلڈ ٹرانس فیوژن نہیں دیں گی؟''

(اسے لگا جیسے وہ اپنے کو ذلیل کر رہا ہو، لیکن اس ذلت میں اسے ایک عجیب سی خوشگواری بھی محسوس ہوئی۔)

''خود تمھیں نے تو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یاد ہے؟'' اس نے پوچھا، اپنی اسی سخت گیری کے ساتھ، پھر بھی بے یقینی اس کی آنکھوں میں ــــ ان قہوہ رنگ، کامنی آنکھوں میں ــــ صاف نمشمار ہی تھی۔

(چلو جانے دو، کیا رکھا ہے۔ اپنی دانست میں وہ قصوروار تھی بھی نہیں۔ اور پھر، بہر حال، یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ دونوں ایک اسپتال میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ رہیں؟)

''پچھلی بار مجھے اچھا لگا تھا۔ اب اور دے دیجیے۔''

وہ مسکرایا، اس کے زخم میں کجی سی پڑی اور وہ کچھ مختصر نظر آنے لگا۔

(خیر، اس وقت اسے معاف کیے دیتے ہیں۔ جو تھوڑی بہت غلط فہمی باقی رہ گئی ہے، اس کی صفائی آئندہ کسی وقت کر لیں گے۔)

کوئی چیز تیزی سے ویرا کی آنکھوں میں چمک اٹھی، ندامت کا کوئی چھچھلتا سا احساس۔

''شاید کل خون کی ڈلیوری ہو،'' وہ بولی۔

وہ ہنوز کسی غیر مرئی سہارے سے لگی کھڑی تھی، تاہم وہ سہارا اس کے ہاتھ کے نیچے یا پگھلنے لگا

تھا، یا منہدم ہونے۔

"لیکن ایک شرط ہے: ٹرانس فیوژن آپ اور صرف آپ ہی دیں گی!" الیک نے مطالبہ کیا، "ورنہ نہیں لوں گا۔"

اس نے ان سب باتوں سے گریز، اور کسی بھی قسم کی پیش بنی سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیا:

"اگر میں ڈیوٹی پر ہوئی، اور اگر ہو سکا تو۔"

وہ آگے بڑھ گئی۔

وہ بڑی دلکش تھی، اور تمام باتوں کے باوصف دلکش تھی۔

تاہم ـــ وہ کس چیز کی جستجو میں تھا؟ اگر اس کی قسمت میں "طولِ عمر کی سزا" ہی لکھی تھی، تو یہاں کیا ڈھونڈتا پھر رہا تھا؟

الیک ایک راہداری میں احمقوں کی طرح کھڑا یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہاں کے قصد سے نکلا تھا۔

ہاں، ٹھیک ہے! وہ دیمکا (Demka) سے ملاقات کے لیے نکلا تھا۔

دیمکا اپنے چھوٹے سے کمرے میں پڑا ہوا تھا، جس میں دو پلنگ تھے۔ اس کا ساتھی مریض ڈسچارج ہو چکا تھا، اور آپریشن کے کمرے سے نئے مریض کی آمد کل سے پہلے متوقع نہ تھی۔ دریں اثنا، وہ بالکل تنہا تھا۔

پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور درد کی وہ اولین سوزش اس کی بریدہ ٹانگ میں ماند پڑ چکی تھی۔ آپریشن کا تجربہ سمٹ کر ماضی بن چکا تھا، تاہم ٹانگ میں زندگی مسلسل موجزن اور کسک اسی طرح برقرار رہی جیسے اسے قلم نہ کیا گیا ہو۔ قلم شدہ ٹانگ کی ہر ہر انگلی کی پھڑکن دیمکا اب بھی صاف جدا جدا محسوس کر رہا تھا۔

الیک کو دیکھتے ہی دیمکا فرطِ مسرت سے یوں کھل اٹھا جیسے الیک اس کا بڑا بھائی ہو۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ کینسر وارڈ کے دوستوں کو وہ اپنے عزیز و اقارب ہی سمجھتا تھا۔ دیمکا کے نائٹ اسٹینڈ پر توشے دان کے نیچے اسپتال کی کچھ عورتوں کی طرف سے کھانے پینے کی چیزوں کا تحفہ رکھا ہوا تھا۔ لیکن خارجی

دنیا میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس سے ملاقات یا تحفے دینے کے لیے آتا۔
دیمکا پشت کے بل پڑا ہوا اپنی ٹانگ کو، یا اس کا جو کچھ بچ رہا تھا، یعنی ران اور پٹھوں کے بڑے سے گچھے کو، آرام دے رہا تھا تاہم اس کا سر اور ہاتھ آزادی سے حرکت کر رہے تھے۔
''ہیلو الیک!'' اس نے الیک کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بیٹھو۔ مجھے ساری باتیں بتاؤ۔ وارڈ میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟''
بالائی منزل کا وارڈ، جسے وہ چھوڑ آیا تھا، وہ دنیا تھی جس کا دیمکا آہستہ آہستہ عادی ہو چکا تھا۔ یہاں، زیریں منزل پر، دوسری نرسیں، دوسرے اردلی اور دوسرے طریقے تھے۔ ہر شخص سارا وقت اسی جھگڑے میں پڑا ہوا تھا کہ کس کے اوپر کیا ذمے داری ہے۔
''وارڈ؟'' الیک نے دیمکا کے کھبتے ہوئے بلند خط و خال کو دیکھا۔ اس کے رخسار پچک گئے تھے، اور بھنویں، ناک اور ٹھوڑی آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ ''سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔''
''کیا بوڑھا کادرے (Cadre) اب بھی وہیں ہے؟''
''اب بھی وہیں ہے۔''
''وادیم (Vadim) کیسا ہے؟''
''وادیم کی حالت ٹھیک نہیں۔ سونا ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ ڈاکٹروں کو ڈر ہے کہ کہیں مرض جسم کے دوسرے حصوں میں نہ پھیل جائے۔''
دیمکا نے وادیم کے تعلق سے سر کو یوں ہلایا جیسے کسی کم عمر والے کے تعلق سے ہلا رہا ہو۔
''بیچارا۔''
''دیمکا، شکر کرو کہ تمھاری ٹانگ بروقت کاٹ دی گئی۔''
''تو کیا ہوا؟ سرطان جسم کے دوسرے حصوں میں اب بھی پھیل سکتا ہے۔''
''اغلب نہیں۔''
لیکن ڈاکٹروں کو ملا کر کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ وہ مہلک خلیے، وہ لینڈنگ کرافٹس، تیرتے ہوئے آگے نہیں نکل گئے تھے اور کہاں کہاں اپنی قاتل ٹولی والوں کو نہیں اتار دیا تھا؟
''تمھیں ایکس رے لگا رہے ہیں؟''

''اسٹریچر پر لاد کر ایکس رے کے کمرے میں لے تو جاتے ہیں۔''
''شکر خدا کا، دوست اب تمھارے آگے کا راستہ بالکل صاف اور سیدھا ہے— اب تم اچھے ہونے کے معاملے میں کوئی آنا کانی نہیں کر سکتے، اور تمھیں بیساکھی کا استعمال سیکھنا ہی ہوگا۔''
''مجھے دو بیساکھیاں چاہیے ہوں گی، پوری دو۔''
اس یتیم نے پہلے ہی سے سارا حساب لگا رکھا تھا۔ پہلے وہ بالغوں کی طرح بھنویں چڑھایا کرتا تھا؛ اب واقعی خود بالغ ہو گیا تھا۔
''تمھارے لیے بیساکھیاں کہاں بنیں گی؟ یہیں؟''
''آرتھوپیڈک کلینک میں۔''
''خدا کرے مفت میں بھی مل جائیں۔''
''میں نے مفت ملنے ہی کی درخواست دی ہے۔ قیمت ادا کرنے کے واسطے میرے پاس دھرا ہی کیا ہے۔''
اس نے آہ بھری، اتنی ہی آسانی سے جس سے وہ لوگ بھرتے ہیں جنھیں سال در سال زندگی میں خوش دل رہنے کا بھولے سے کوئی بہانہ نہیں ملتا۔
''تم اگلے سال تک دسواں درجہ کیسے ختم کر لو گے؟''
''وہ تو ختم کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ پھر زنجیر تڑا کر بھاگنا پڑے گا۔''
''تو کھانے پینے کے لیے کہاں سے لاؤ گے؟ خراد پر کھڑے ہو کر تو کام کر نہیں سکو گے۔''
''انھوں نے مجھے اپاہجوں کا درجہ اور پینشن دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دوسرا نہیں تو شاید تیسرا درجہ۔''
''تیسرا— یعنی چہ؟'' کستاگلوتف کو معذوروں کی درجہ بندی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، بعینہٖ جیسے اسے دیوانی قوانین کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔
''کم ترین درجہ ہے۔ بس روکھی سوکھی کے لیے کافی ہے، روغن اور میٹھے کا عیش بھلا اس میں کہاں۔''
بالغ آدمی کی طرح دیمکا نے خوب حساب کتاب کر رکھا تھا۔ رسولی نے اس کی زندگی تقریباً غارت کر دی تھی، تاہم وہ اپنے مقصد کی طرف ثابت قدمی سے گامزن تھا۔

''اور یونیورسٹی جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کوشش کرنی ہوگی۔''

''ادب کا کورس؟''

''آں ہاں۔''

''سنو، دیمکا، ادب کی چھٹی کرو۔ میری بات مانو۔ یہ تمھیں تباہ کرکے چھوڑے گا۔ اس کے بجائے ریڈیو کی مرمت جیسا کوئی کام سیکھ لو — تمھاری جان کم ضیق میں رہے گی اور ایک نہ ایک دن تم سب کو متحیر بھی کر سکو گے۔''

''جہنم رسید کرو ریڈیوں کو!'' دیمکا خفگی سے اچھل پڑا۔ ''میں سچ کا عاشق ہوں۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو تم ریڈیوں کی مرمت بھی کرنا — اور سچ بھی بولنا۔ پاگل مت بنو!''

لیکن وہ متفق نہ ہو سکے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ الیک کے مرض پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔ یہ دیمکا کے بالغ ہونے کی ایک اور دلیل تھی، یہی اس کی دوسروں میں دلچسپی: شباب صرف اپنے ہی سے سروکار رکھتا ہے۔ چنانچہ الیک نے اپنی بیماری کے بارے میں ایسے ہی گفتگو کی جیسے کسی بالغ سے کرتا۔

''آثار اچھے نہیں!'' دیمکا نے اداسی سے سر ہلایا۔

''مطلب یہ کہ تم میری جگہ لینے کے لیے تیار نہیں، ٹھیک ہے نا؟''

''خدا جانے۔''

یہی لگتا تھا کہ دیمکا اسپتال میں کوئی ڈیڑھ ماہ اور ٹنگا رہے گا: ایکس رے کے ذریعے علاج کے واسطے، بیساکھیوں کی فراہمی کے انتظار میں۔ مئی میں کہیں جا کر یہاں سے نکلنے کا پروانہ ملے گا۔

''یہاں سے نکلتے ہی پہلے کہاں جاؤ گے؟''

''سیدھا چڑیا گھر!'' دیمکا پر زندہ دلی طاری ہوگئی۔ وہ الیک سے چڑیا گھر کا تذکرہ پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ ایک بار دونوں اسپتال کی چھت پر کھڑے ہوئے تھے، اور دیمکا نے بڑے اعتماد سے ایک سمت میں اشارہ کرکے بتایا تھا کہ چڑیا گھر اس طرف ہے: دریا پار درختوں کے وہ جو بھاری جھنڈ نظر آ رہے ہیں، ان کے پیچھے۔ دیمکا برسوں تک وحشی جانوروں کے بارے میں پڑھتا رہا تھا، نشریات سنتا رہا تھا، تاہم آج تک اسے ایک زندہ لومڑی یا ریچھ تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، چیتے اور ہاتھی کا تو خیر

ذکر ہی کیا۔ اس کی پرورش جس علاقے میں ہوئی تھی وہاں نہ شکار کے میدان تھے اور نہ جانوروں کے واسطے حفاظتی پناہ گاہیں، نہ سرکس، نہ جنگلات۔ اس کی بڑی تمنا تھی کہ کسی چڑیا خانے جائے اور جانوروں کا مشاہدہ کرے، اور عمر کے ساتھ ساتھ اس تمنا کا رنگ ذرا بھی تو پھیکا نہیں پڑا تھا۔ اسے چڑیا گھر میں کسی بہت ہی خاص بات کے ہونے کی توقع تھی۔ جس دن اس کی دکھتی ہوئی ٹانگ اسے اس شہر اور اس اسپتال میں لائی، وہ چھوٹتے ہی چڑیا گھر کی زیارت کو پہنچ گیا تھا۔ بدقسمتی سے چڑیا گھر اس دن بند تھا، کیونکہ وہ پیر کا دن تھا۔ ''سنو، الیک! تم تو یہاں سے اب جلد ہی ڈسچارج ہو جاؤ گے، ہو جاؤ گے نا؟''

الیک شا نے ڈھلکا کے بیٹھ گیا۔ ''بہت ممکن ہے۔ میرے خون میں اس علاج کو برداشت کرنے کی اب اور تاب نہیں رہی ہے۔ متلی مالش سے جان عذاب میں ہے۔''

''تو پھر تم چڑیا خانے جاؤ گے، جاؤ گے نا؟'' دیمکا کو پورا یقین تھا کہ الیک وہاں ضرور جائے گا؛ بصورت دیگر الیک کے بارے میں اس کی رائے خراب ہو جائے گی۔

''ہاں، شاید۔''

''شاید وائد نہیں، بلکہ ضرور! مہربانی کر کے وہاں ضرور جانا اور ہاں، بعد میں مجھے پوسٹ کارڈ ڈالنا نہ بھولنا۔ ٹھیک ہے نا؟ تمھیں بہت زیادہ زحمت نہیں ہوگی، اور میرا دل خوش ہو جائے گا۔ لکھنا کہ وہاں کون کون سے جانور ہیں، اور ان میں سب سے زیادہ دلچسپ کون سے۔ لکھو گے نا؟ اس طرح مجھے یہاں سے چھوٹنے سے ایک ماہ پہلے ہی چڑیا گھر کے بارے میں معلوم ہو جائے گا! تو تم جاؤ گے نا؟ مجھے خط بھی لکھو گے؟ کہتے ہیں وہاں مگرمچھ اور شیر بھی ہیں...''

الیک نے وعدہ کر لیا۔

پھر وہ وہاں سے چلا آیا (اسے خود بھی تو سونا تھا)۔ پیچھے بڑی دیر تک دیمکا نے، جو اپنے چھوٹے سے بند کمرے میں بالکل تنہا تھا، اپنی کوئی کتاب وتاب نہیں پڑھی، بس پڑے پڑے چھت اور کھڑکی کو گھورتا رہا، کچھ سوچتا رہا۔ کھڑکی سے کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا؛ اس پر جھلملی پڑی ہوئی تھی، اور وہ طبی مرکز کی ہوحق دیوار کے رخ کھلتی تھی۔ اب کمرے کی دیوار پر دھوپ کی کھینچی ہوئی دھاریاں بھی نہیں تھیں، بس سورج کی پھیکی سی گھٹی گھٹی روشنی آ رہی تھی، جو ابر کی زد میں ضرور تھا، لیکن اس سے مکمل ڈھنپا ہوا نہیں۔ باہر شاید بہار کا کوئی کمزور سا دن تھا، نہ گرم، نہ اجلا، جب بہار خاموشی سے اپنا کام کیے

جاتی ہے۔

دیمکا بے حس وحرکت پڑا خوشگوار چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا: کیسے اس کی ٹانگ آہستہ آہستہ دکھنا بند ہو جائے گی؛ کیسے وہ بیساکھیوں پر تیزی اور پھرتی سے چلنا سیکھ لے گا؛ یوم مئی سے پچھلا دن کیسا ہوگا—یوم مئی جو خالص گرمیوں کا دن ہوتا ہے۔ جب دیمکا صبح اسپتال سے گلوخلاصی اور شام ریل گاڑی پکڑنے کا درمیانی وقت چڑیا گھر میں گزارے گا؛ تب اس کے پاس کتنا وقت ہوگا، اور وہ کتنی تیزی سے اور کتنی خوش اسلوبی کے ساتھ سیکنڈری اسکول کے تمام مضامین نپٹا کر ان تمام اہم کتابوں کو پڑھ جائے گا جو مطالعے سے رہ گئی تھیں۔ اب، انتہائے کار، بہت سی شامیں برباد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی جب وہ دوسرے لوگ رقص کے لیے جاتے اور وہ اس اذیت میں مبتلا رہتا کہ جائے یا نہ جائے، حالانکہ خوب معلوم تھا کہ اسے رقص وقص کرنا بالکل نہیں آتا۔ بس اب یہ سب ختم شد۔ بس بتی جلاؤ اور مطالعہ کرو۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

''اندر آ جاؤ'' دیمکا بولا۔ (''اندر آ جاؤ'' اس نے ایک خاص تلطف سے کہا۔ وہ کسی ایسی جگہ نہیں رہا تھا جہاں لوگوں کو اندر اس سے ملنے آنے کے لیے پہلے دروازہ کھٹکھٹانے کی حاجت رہی ہو۔)

پھٹ سے دروازہ کھلا اور آسیا (Asya) داخل ہوئی۔

وہ اس طرح در آئی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو، لیکن اندر آتے ہی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کے بعد اس کے چوکھٹے سے اس طرح لگ کر کھڑی ہوگئی کہ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے دستے پر تھا اور دوسرے سے وہ اپنی قبا کے گریبان کے دونوں سرے تھامے ہوئے تھی۔

یہ وہ آسیا ہرگز نہیں تھی جو ''سہ روزہ معائنے'' کے واسطے یہاں آئی تھی، اور جس کا پیچھے بڑی بے چینی کے ساتھ ونٹر اسٹیڈیم ٹریک پر انتظار ہو رہا تھا۔ وہ کمہلائی ہوئی تھی اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، اور اس کے سنہری بال، جو اب چشم زدن میں تو متغیر ہونے سے رہے، بڑے قابل رحم طور پر بکھرے ہوئے تھے۔

آسیا کا ڈریسنگ گاؤن بٹنوں سے بے نیاز وہی بدصورت باتھ روب تھا جسے اس سے پہلے بہت سے اور لوگ بھی استعمال کر چکے تھے، اور جسے خدا جانے کن کن پتیلیوں میں ابال کر جراثیم سے پاک کیا

گیا تھا۔ تاہم یہ اس پر پہلے کی بہ نسبت زیادہ مناسب لگ رہا تھا۔
لرزتی بھنوؤں کے ساتھ آسیا نے دیمکا کی طرف دیکھا: تو کیا یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ پناہ کی تلاش میں بھاگ کر آنا چاہتی تھی؟ بس، یا ابھی اور آگے بھاگے؟
لیکن یہ نئی آسیا، یہ درد آشنا آسیا، جسے ایک درجے، تین طول طویل سفروں، اور ایک پوری زندگی کے علم کے اعتبار سے دیمکا پر اب اور فوقیت حاصل نہیں رہی تھی ــــ سیدھی دیمکا کے دل میں اتر گئی۔
''آسیا!'' اس نے چلا کر کہا، ''بیٹھ جاؤ! کیا ہوا؟''
اُس پہلی مرتبہ کے بعد سے دونوں نے بار ہا گفتگو کی تھی، اس کی ٹانگ کے بارے میں باتیں کی تھیں (آسیا قلم کروانے کی پرزور مخالف تھی)، اور آپریشن کے بعد وہ اس کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی، دو مرتبہ، اور اس کے لیے سیب اور بسکٹ بھی لائی تھی۔ اس پہلی شام اپنی ملاقات کے دوران ان کا انداز ہر چند سادہ اور براہ راست سہی، بعد از آں اور بھی صاف اور صریح ہو گیا تھا۔ آسیا نے اُسے بتا دیا تھا ــــ ایک دم سے نہیں، تاہم صاف صاف لفظوں میں، کہ اُسے کیا مرض لاحق تھا: اس کی دائیں چھاتی میں درد تھا، ڈاکٹروں کو اس میں ایک سخت سی گٹھی ملی تھی، اب وہ اس کا علاج ایکس رے اور دوا کی ٹکیوں سے کر رہے تھے۔
''بیٹھ جاؤ، آسیا! بیٹھ جاؤ!''
آسیا کا ہاتھ دستے سے پھسل کر نیچے آ رہا، لیکن وہ اسے دروازے اور پھر دیوار پر یوں پھراتی ہوئی آگے بڑھنے لگی جیسے محض لمس کے سہارے اپنا راستہ تلاش کر رہی ہو، تا آنکہ وہ دیمکا کے سرہانے پڑے پستہ قد اسٹول تک پہنچ گئی۔
وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔
وہ بیٹھ گئی اور دیکھا، دیمکا کی آنکھوں کی طرف نہیں، بلکہ ان سے آگے، اس کے تکیے کو۔ اس نے براہ راست دیمکا کا سامنا نہیں کیا، اور وہ بل کھا کر آسیا کا سامنا کرنے سے معذور تھا۔
''کیا ہوا آسیا؟'' اب بزرگ بننے کی اس کی باری تھی! اس نے تکیوں کے انبار پر کسی نہ کسی طرح اپنا سر آسیا کے رخ کیا ــــ صرف سر ہی، کیونکہ وہ بڑی بے چارگی سے پشت کے بل پڑا ہوا تھا۔
آسیا کے ہونٹ لرزے اور پلکیں جھپک گئیں۔

''آ—آ—سین کا!'' دیمکا نے کسی نہ کسی طرح یہ لفظ ادا کر ہی دیا (اسے آسیا کے تعلق سے بے حد افسوس ہو رہا تھا، ورنہ اس مشفقانہ ''آسین کا'' سے تخاطب کی کبھی ہمت نہ کرتا)، اس سے قبل کہ آسیا نے اپنا چہرہ اس کے تکیے میں دھنسا دیا، ایسے کہ اس کا سر دیمکا کے سر سے جا لگا اور اس کی ایک لٹ دیمکا کے کان کو گدگدانے لگی۔

''خدا کے واسطے، آسین کا!'' اس نے چلا کر کہا اور اپنے ہاتھ کو کمبل کے اوپر آسیا کے ہاتھ کی جستجو میں حرکت دی، لیکن پا نہ سکا۔

وہ اس کے تکیے میں سر دیے آہ و بکا کر رہی تھی۔

''خدارا، آسین کا! بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا؟ بتاؤ نا۔''

لیکن اس نے اندازہ لگالیا تھا— تقریباً۔

''وہ ق—ل—م کر دیں گے!''

وہ رو پڑی، اور بڑی دیر تک روتی رہی، پھر کراہی:

''اُ—اُ—ف!''

دیمکا کو یاد نہ آسکا کہ اس سے زیادہ درد انگیز کراہ پہلے کبھی اس نے سنی ہو۔

''ممکن ہے وہ قلم نہ کریں،'' اس نے دل جوئی کی کوشش کی۔ ''ممکن ہے انھیں اس کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔''

لیکن اس کا احساس تو اسے ہو گیا تھا کہ اس ''اُ—اُ—ف!'' کو محض باتوں کے ذریعے ٹالا نہیں جا سکتا۔

وہ اس کے تکیے میں منھ دیے مسلسل روئے چلی گئی، تا آنکہ دیمکا کو لگا اب وہ گیلا ہونے لگا ہے۔

دیمکا نے اس کا ہاتھ ڈھونڈ ہی نکالا اور اسے نرمی سے تھپتھپانے لگا۔

''آسین کا! عین ممکن ہے انھیں اس کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔''

''ن...ن...نہیں... انھوں نے جمعے کا دن بھی مقرر کر لیا ہے۔''

آسیا نے ایک طویل آہ بھری جس کو سن کر دیمکا کی روح تڑپ اٹھی۔

دیمکا آسیا کا آنسوؤں سے مسطر چہرہ نہ دیکھ سکا، صرف اس کی وہ لٹیں ہی نظر آ رہی تھیں جواب

بھیگ چکی تھیں اور گدگداتی ہوئی بین اس کی آنکھوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

دیمکا نے کچھ کہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن الفاظ ہی نہیں ملے۔ اسے رونے سے باز رکھنے کے اظہار کے طور پر بس اس کی گرفت آسیا پر سخت تر ہوگئی۔ اسے اپنے سے کہیں زیادہ آسیا پر رحم آ رہا تھا۔

''جینے کے لیے... اب... باقی کیا بچا ہے؟'' آسیا نے آہ وزاری کی۔ ''بچا ہی...کیا ہے؟''

دیمکا کو اپنے تجربے کی روشنی میں اس سوال کا ایک جواب معلوم تھا، لیکن یہ تجربہ اتنا گڈمڈ تھا کہ وہ اسے وضاحت سے بیان نہیں کرسکتا تھا۔ اور بہ فرضِ محال کر بھی سکتا تو آسیا کی آہ و بکا کچھ اس نوعیت کی تھی کہ نہ وہ اسے قائل کرسکتا تھا، نہ کوئی دوسرا، کیونکہ ''آسیا کے'' تجربے کے حساب سے صاف ظاہر تھا کہ زندہ رہنے کے واسطے اس کے پاس اب کوئی بہانہ نہیں رہا تھا!

''ا... ا... اب... م... م... مجھ سے کون محبت ک... ک... کرے گا؟'' وہ فرطِ غم سے ہکلائی۔

اس نے نئے سرے سے چہرہ تکیے میں دفن کردیا اور دیمکا کے رخسار بھگا دیے۔

''پروا نہ کرو،'' اس نے آسیا کا ہاتھ کچھ اور زور سے دبایا اور دلاسا دیا۔ ''تمھیں معلوم ہی ہے شادی کیسے ہوتی ہے... لوگوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں... ایک دوسرے کو بھا جاتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ خوب نبھاؤ ہو جاتا ہے...''

'''خوب نبھاؤ' کی خاطر کون بے وقوف محبت کرتا ہے؟'' وہ برہمی سے چمک کر بولی، جیسے کوئی گھوڑا اچانک الف ہو جائے، اور درشتی سے اپنا ہاتھ اُس کی گرفت سے کھینچ لیا۔ تب پہلی بار دیمکا کو اس کا آنسوؤں سے تر، سرخ، سوجا ہوا، قابلِ رحم اور برہم چہرہ نظر آیا۔ ''محض ایک چھاتی والی عورت کو کون چاہتا ہے؟ کون؟ سترہ سال ہی میں!'' وہ دیمکا پر گرجی، جیسے وہی اس سارے المیے کا ذمے دار ہو۔

دیمکا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح اس کو تسلی دے۔

''بتاؤ، اب میں 'بیچ' کس منھ سے جاؤں گی؟'' وہ شدتِ غم سے چلائی جیسے اس تازہ خیال نے ایک نئے تازیانے کا کام دیا ہو۔ ''ہاں بیچ! اب تیرنے کیسے جاسکوں گی؟'' یہ خیال آسیا کی ساری ہستی سے پیچ کش کی طرح بل کھاتا ہوا گزر گیا، اس میں کھب گیا اور اسے دیمکا سے دور فرش پر لا پھینکا، جہاں

وہ ڈھیر ہوگئی، اور ہاتھوں میں مضبوطی سے اپنا سر بھینچ لیا۔

آسیا نے ایک ناقابلِ برداشت غم کے ساتھ پیرا کی کے انواع و اقسام کے لباس تصور کر ڈالے — شانوں پر فیتے سے اٹکے ہوئے، بغیر فیتے والے، یک جزی، دو جزی، موجودہ فیشن اور آنے والے فیشن کے مطابق، نارنجی، نیلے، اودے، موج رنگ، یکساں رنگ والے، دھاری دار، آرائشی کور والے، آرائشی کور سے بے نیاز — جو وہ آئینے کے مقابل پہن کر کبھی نہ دیکھ سکے گی، جو وہ اب نہ کبھی خرید سکے گی نہ پہنے گی۔ اور وجود کا یہ پہلو، یہی کہ پیچ پر اپنی نمائش کا عدم امکان، اب اسے وہ حقیقت معلوم ہونے لگی جو سب سے زیادہ پژمردہ کر دینے والی اور باعثِ شرم تھی۔ اصلاً یہ وہی پہلو تھا جس نے زندگی سے اس کی ادنیٰ ترین معنویت بھی چھین لی تھی۔

تکیوں کے مقبرے سے دیمکا نے بڑبڑا کر کوئی ان گھڑ اور ناموزوں بات کہی۔

''یوں سمجھو، اگر کوئی بھی تمھیں نہیں قبول کرے گا تو... ہاں، ہاں، ظاہر ہے، میں خوب جانتا ہوں، میرا کیا حلیہ بن گیا ہے... تاہم میں تم سے شادی کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ تم، بہر حال، خوب جانتی ہو۔''

''دیمکا، سنو!'' ایک اور خیال کی کاٹ محسوس کر کے آسیا جلدی سے کھڑی ہوگئی اور چہرہ دیمکا کے رُخ کر لیا، اور اسے پوری طرح سے کھلی ہوئی اور آنسوؤں سے معرّا آنکھوں سے دیکھا۔ ''سنو — تم آخری شخص ہو۔ تم وہ آخری شخص ہو جو اسے اس کی اصلی حالت میں دیکھ سکتا ہے، چوم سکتا ہے۔ کوئی اور شخص کبھی اسے نہیں چوم سکے گا! دیمکا! کم از کم تم... تو اسے چوم لو۔ کم از کم تم!''

اس نے ہاتھ روب کھینچ کر تن سے جدا کر دی، حالانکہ وہ خود بخود پہلے ہی سے نیچے کی طرف ڈھلکی جا رہی تھی، اور اب ایک بار پھر آنسوؤں اور آہ و بکا سے پسپا ہو کر اپنے نائٹ گاؤن کا ڈھیلا گریبان پیچھے کے رخ اٹھایا اور اپنا قسمت گزیدہ دایاں پستان ننگا کر دیا۔

وہ دھوپ کی طرح چمک رہا تھا، دھوپ جو سیدھی کمرے میں برس رہی ہو۔ پورا کمرہ گلنار ہو گیا، وہ بھوری رنگت کا سر پستان، جو جسامت میں اس سے کہیں بڑا تھا جو دیمکا نے تصور نے کر رکھا تھا، اس کے سامنے تیرنے لگا۔ اس گلابی جسم کی یورش کو سہنے کی تاب اس کی آنکھوں میں نہ رہی۔

آسیا اس کے چہرے کے پاس جھک کر کھڑی ہوگئی اور اسی حالت میں رہی۔

''اسے چومو!'' اس نے مطالبہ کیا، اور منتظر رہی۔ ''اسے چومو!''

پستان کی حرارت، جو آسیا نذرانے کے طور پر اسے پیش کر رہی تھی، دیمکا کو محسوس ہوئی، اور وہ شکرگزار، مسحور، اسے بڑے ندیدے پن سے چومنے لگا، اس گدر، خم کھاتی ہوئی سطح کے چپے چپے کو چومنے لگا جو اس کے اوپر انڈلی پڑ رہی تھی، اور جو کسی تصویر یا مجسمے کے مقابلے میں کہیں زیادہ پرنوازش، پُر ادا، اور دل پذیر تھی۔

''تم اسے یاد رکھو گے، رکھو گے نا؟ تم یاد رکھو گے کہ میں اس کی مالک ہوا کرتی تھی، رکھو گے نا؟ اور یہ کیسا لگتا تھا؟''

آسیا کے آنسو ٹپ ٹپ دیمکا کے چھوٹے ترشے ہوئے بالوں پر گرنے لگے۔

اس نے اپنا پستان نہیں ہٹایا، نہ اپنی جگہ سے ٹلی؛ اور وہ اس بھورے رنگ کی گھنڈی سے دوبارہ سرگرمِ عمل ہو گیا؛ اس کے ہونٹوں نے بڑی ملائمیت سے اس کی چھاتیوں کے ساتھ وہ کیا جو مستقبل میں آسیا کا کوئی شیرخوار کرنے کا اہل نہ ہو گا۔ کمرے میں کوئی داخل نہ ہوا، اور وہ اپنے سامنے، اوپر، آویزاں اعجوبے کو بنادم لیے بوسے دیتا چلا گیا۔

آج ایک اعجوبہ — کل ردی کی ٹوکری میں۔

❋

جولین بارنز

❄

ایما بوواری کی آنکھیں

واللہ یہ مذاق بالکل نہیں۔ یقین کیجیے۔ ''ایما بوواری کی آنکھیں'' اگر پڑھنے میں، اپنے لب و لہجے، بنت، اور کیفیت میں، فکشن سے زیادہ کسی بھاری بھرکم تنقیدی مقالے ـــ اور وہ بھی جو اپنے تحقیقی آلات کے بوجھ سے بیٹھا جارہا ہو ـــ کا حصہ معلوم ہوتا ہے، تو اس میں مترجم بالکل بےقصور ہے۔ قصوروار تو خود مصنف بھی نہیں: اگر آپ چارلس ڈکنز کے ساڑھے نو سو صفحے کے فیل جثہ ناول Bleak House جیسی تحریروں کے فوراً بعد جیمز جوائس کا Ulysses پڑھیں، تو اسے ناول ماننے سے ہی انکار کر دیں؛ بعدازآں ایسے اینٹی ناول مصنفین جیسے آلاں راب گریئے (Alain Robbe-Grillet) وغیرہ کی تخلیقات کو پڑھیں تو انھیں ناول کی رسوائی اور ''یولی سیز'' کو عین اس کی معراج تعبیر کرنے لگیں۔ ناول کی ہیئت اور تیکنیک دونوں میں مسلسل تجربے ہوتے رہے ہیں، اور ہمیں جلد یا بدیر ناول کی کوئی ایسی تعریف ضرور وضع کرنی ہوگی جو اپنی پہنائی میں اتنی کریم، اتنی غنی ہو کہ ایک طرف، مثلاً ''ٹرسٹام شینڈی'' (لارنس سٹرن) اور ''بلیک ہاؤس'' کو اپنے میں جگہ دے سکے تو دوسری طرف مثلاً ''یولی سیز''، ''رقابت'' (راب گریئے)، ''وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت''، ''ابدیت'' (میلان کنڈیرا)، اور ''سیمیا'' (نیر مسعود) جیسی تحریروں کو۔

ہمعصر برطانوی ناول نگار جولین بارنز (Julian Barnes) کے ساتھ بھی بس کچھ یہی قصہ ہے۔ سکہ بند ـــ اور اردو کے رائج الوقت تنقیدی ـــ انداز نظر کو لیں، تو ''فلوبیر کا طوطا'' (*Flaubert's Parrot*) (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) ـــ جس کے چھٹے باب کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے ـــ ناول بمشکل ہی نظر آئے گا۔ ترجمے سے میرا مقصد بھی یہی تھا: ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ زندگی میں ان چیزوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کا حوصلہ دلانا جو عام مزاج اور عام ڈھرّے سے انحراف کا حوصلہ رکھتی ہوں، لیکن ہنرمندی اور سلیقے کے ساتھ۔ بات حیرت اور گنجائش پیدا کرنے تک آ پہنچی ہے تو اس ناول کے بعض ابواب کے عنوان بھی کیوں نہ درج کر دیے جائیں، تاکہ آپ کو جو صدمہ پہنچنا ہے، ایک بار ہی پہنچ جائے۔ ''کرونالوجی'' (واقعات کی

زمانی ترتیب)، ''فلوبیر کی بیسٹیری'' (پندوموعظت کی کتاب جو جانوروں کے قصوں کے پیرائے میں لکھی جائے)، ''ریل گاڑی کی نشاندہی کرنے والے کا ہدایت نامۂ فلوبیر''، ''فلوبیر کے اسفار محرفہ'' (بلکہ ''غیر نوشتہ'')، اور ''بریتھ ویٹ کی مرتبہ مقبول تصورات کی لغت''، وغیرہ، ایسے عنوان نہیں جن کا ناول کے عنوان کی حیثیت سے آسانی کے ساتھ تصور کیا جا سکے۔

سرراہے: ترجمے والے باب میں جن اینڈ سٹارکی (Enid Starkie) کا ذکر خیر ہوا ہے، وہ نہ کوئی چھلاوا ہیں اور نہ مسٹر بارنز کی طبع ایجاد کا نتیجہ، بلکہ جیتا جاگتا تاریخی وجود رہ چکی ہیں، اور ان کا شمار، واقعی، فلوبیر کے متبحر ترین معاصر نقادوں میں ہوتا ہے۔ یوں دیکھیں تو بات اور زیادہ الجھ جاتی ہے۔ الغرض، بہتر ہوگا کہ ہم فکشن سے متعلق اپنے موروثی معتقدات کی صحت پر اصرار کرنا چھوڑ دیں۔ اس باب کو اسی طرح پڑھیے جو اس کی وضع حیات کا تقاضا ہے۔ ماریو برگس یوسا (Mario Vargas Llosa) نے فلوبیر اور ''مادام بوواری'' پر اپنی تازہ کار تصنیف *The Perpetual Orgy* میں کیا خوب کہا ہے: '''مادام بوواری' کے خالق کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ حقیقی ادب ہمیشہ ہی 'خطرناک' ہوتا ہے (بنابریں، فلوبیر شاعر لوئی بویے کی کتاب ''آخری نغمے'' کے دیباچے میں رقم طراز ہے، ''اسلوب، جو بذاتہٖ فن ہے، ہمیشہ ہی حکومتوں کو باغیانہ اور بورژوا کو غیر اخلاقی نظر آتا ہے'') اور اس نے ادب کو ٹھیک اس حیثیت سے قبول کرنے کا مطالبہ بھی کیا: یعنی باقاعدگی [معمول] کے توڑ کی حیثیت سے...'' (صفحہ: ۲۳۹ تا ۲۴۰)۔

جولین بارنز ۱۹۴۶ء میں لائسسٹر (انگلستان) میں پیدا ہوئے، اور لندن اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی، لیکن نان نفقے کے انتظام کے لیے فری لانس صحافی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ''فلوبیر کا طوطا'' سے پہلے ان کے دو اور ناول چھپ چکے ہیں: *Metroland* اور *Before She Met Me* اور دو اس کے بعد: *Staring at the Sun* (۱۹۸۷ء) اور *History of the World in 10 1/2 Chapters* (۱۹۸۹ء)۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے بعض چیزیں فرضی ناموں سے بھی لکھی ہیں۔

— مترجم

❄

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مجھے نقادوں سے کیوں نفرت ہے۔ عادی وجوہ کی بنا پر نہیں: کہ یہ ناکام تخلیق کار ہیں (عام طور پر نہیں ہوتے؛ ناکام نقاد تو ہو سکتے ہیں، لیکن یہ الگ بات ہے)؛ یا یہ طبعاً خوردہ گیر، حاسد اور خود پسند ہوتے ہیں (عام طور پر نہیں ہوتے؛ بلکہ ان پر تو ضرورت سے زیادہ فیاض ہونے کا الزام دھرنا زیادہ مناسب ہوگا؛ یہ شہرتوں کو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ خود ان کے باریک بین امتیازات نادر تر نظر آنے لگیں)۔ نہیں بھئی، میں جس وجہ سے نقادوں سے نفرت کرتا ہوں — خیر، بعض اوقات ہی سہی — تو وہ اس لیے کہ وہ اس قسم کے جملے لکھتے ہیں:

> فلوبیئر اپنے کرداروں کی تعمیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح بالزاک کرتا تھا، معروضی اور خارجی بیان کے ذریعے؛ سچ تو یہ ہے کہ وہ ان کے ظاہری حلیے کے معاملے میں اس قدر بے پروا واقع ہوا ہے کہ ایک موقعے پر وہ ایما کی آنکھوں کا رنگ بھورا دکھاتا ہے (۱۴)؛ ایک اور موقعے پر گہرا سیاہ (۱۵)؛ اور ایک اور موقعے پر نیلا (۱۶)۔

یہ بے کم و کاست اور مایوس کن فردِ جرم مرحوم ڈاکٹر اینڈ سٹارکی (Enid Stakie) نے لگائی ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں فرانسیسی کی ریڈر امیریٹس اور فلوبیر کی متبحر ترین انگریز سوانح نگار ہیں۔ متن میں جو نمبر شمار ہیں وہ ان فٹ نوٹس کی طرف لے جاتے ہیں جن میں انھوں نے باب اور سطروں کے نمبر دے دے کر گویا ناول نگار کو اپنے نیزے کی اَنی سے گود کر رکھ دیا ہے۔

ایک بار مجھے ڈاکٹر سٹارکی کو سننے کا اتفاق ہوا، اور مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ { بحمداللہ } ان کی فرانسیسی لہجے کی ادائیگی نہایت زشت تھی: بس ویسی ہی ادائیگی جو مدرسۂ زبان کے زائیدہ اعتماد کی غماز، اور اس استناد سے تہی ہوتی ہے جو زبان کو گوش کے ذریعے سیکھنے سے آتا ہے، جو روزمرہ کی درستیِ زبان اور نقالی سے پیدا ہونے والی غلطی کے درمیان ڈگمگاتی رہتی

ہے، اور اکثر دونوں محض ایک ہی لفظ میں۔ لیکن اس سے، ظاہر ہے، آکسفورڈ میں درس و تدریس کی ان کی اہلیت کو کوئی گزند نہیں پہنچتی، کیونکہ یہ دانشگاہ ابھی حال تک زندہ زبانوں کو بھی اسی طرح برتتی رہی ہے جیسے مردہ زبانوں کو: اس طرح وہ کچھ زیادہ باوقار نظر آنے لگتی ہیں، لاطینی اور یونانی کے دور دراز کمال سے زیادہ مشابہہ۔ تاہم مجھے یہ بات خاصی عجیب لگی کہ کوئی شخص جو اپنے نان نفقے کے واسطے فرانسیسی ادب کا رہینِ منت ہو، وہ اس زبان کے بنیادی الفاظ کو اس طرح ادا کرنے سے اس بھیانک درجہ قاصر رہے جس طرح اس کے موضوع (subject) اس کے ہیروز نے (بلکہ اگر آپ چاہیں تو، اس کے تنخواہ دینے والوں نے) انھیں اول اول ادا کیا تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ ایک مرحوم خاتون نقاد سے کیا رکیک بدلہ رہا ہے، اور وہ بھی صرف اتنے سے جرم کی پاداش میں کہ اس نے اس طرف توجہ دلائی کہ فلوبیر کو ایما بوواری کی آنکھوں کا قابلِ اعتماد علم نہ تھا۔ لیکن اب میں "مرے ہوؤں کے بارے میں خوش گفتار رہو"[1] کا، بہرحال، قائل نہیں (ظاہر ہے میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جو بات کر رہا ہوں)؛ پھر اگر کوئی اس قسم کی چیز کی طرف آپ کی توجہ دلائے تو اس پر جتنا برہم ہوا جائے، کم ہے۔ یہ برہمی ڈاکٹر سٹارکی پر نہیں، کم از کم شروع میں نہیں — وہ تو، جیسا کہ عام محاورہ ہے، محض اپنا فرض ادا کر رہی تھیں — بلکہ فلوبیر پر۔ محنتِ شاقہ کے عادی اس عبقری سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے مشہور ترین کردار کی آنکھوں کا رنگ پورے ناول میں ایک جیسا ہی رکھتا؟ ہاں، اور پھر، تادیر اس سے ترش روئی برتنے کا یارانہ پا کر آپ اپنے {برافروختہ} جذبات کا رخ نقاد کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ جتنی بار بھی "مادام بوواری" پڑھی، ہیروئن کی دھنک آنکھوں کی طرف سرے سے کبھی توجہ ہی نہ دی۔ دینی چاہیے تھی؟ آپ دیتے؟ کیا میں اُن دوسری چیزوں پر توجہ دینے میں ضرورت سے زیادہ منہمک تھا جو ڈاکٹر سٹارکی کی نظروں سے خطا جا رہی تھیں (گو اُس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہو سکتی تھیں)؟ بالفاظ دیگر: کیا کہیں کوئی مثالی، مکمل قاری موجود ہے؟ کیا ڈاکٹر سٹارکی نے جس طرح "مادام بوواری" پڑھا، اس میں وہ تمام تاثرات آ جاتے ہیں جو اس کو پڑھتے وقت مجھ میں پیدا ہوئے، اور ان کے علاوہ کثیر مقدار میں بہت کچھ اور بھی، جس کے نتیجے

۱۔ اصل: De mortuis nil bonum.

میں میرا مطالعہ بے معنی قرار پائے؟ نہیں بھئی، خدا نہ کرے! میرا مطالعہ ادبی تنقید کی تاریخ کی رو سے تو بے معنی ہو سکتا ہے، کتاب سے لطف اندوز ہونے کے لحاظ سے بالکل نہیں۔ اب میں یہ تو نہیں ثابت کر سکتا کہ بے تربیت قاری، پیشہ ور نقادوں کے مقابلے میں، حظ اٹھانے کی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے، لیکن میں آپ کو اس ایک فوقیت کے بارے میں ضرور بتا سکتا ہوں جو ہمیں ان پر حاصل ہے۔ ہم بھول سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سارکی اور ان کے قبیلے والوں کے ساتھ حافظے کی لعنت لگی ہوئی ہے۔ یہ جو کتابیں پڑھاتے ہیں، اور جن کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں، وہ ان کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔ یہ ان کا کنبہ کنبہ بن جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے بعض بعض نقاد اپنے موضوع کے حق میں دبا دبا سا سرپرستانہ لب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا طرزِ عمل کچھ یوں ہوتا ہے جیسے فلوبیر یا ملٹن یا ورڈز ورتھ جھولا کرسی میں ہلکورے لیتی ہوئی کوئی سالخوردہ، اکتا دینے والی خالہ رہے ہوں، جس سے باسی پاؤڈر کے بھبکے اٹھ رہے ہوں اور جو ماضی کی بازخوانی کے سوا اور کسی چیز میں دلچسپی نہ رکھتی ہو، اور جس نے سالہا سال سے کوئی نئی بات نہ کہی ہو۔ جی ہاں، اس میں کیا کلام کہ گھر خالہ ہی کا ہے، اور جس کو دیکھیے بلا کرایہ اس میں دھرنا دیے بیٹھا ہے، تاہم، سچ یہ ہے کہ، آپ بہرحال جانتے ہی ہیں... وقت قریب ہے۔

اس کے برعکس، ایک عام لیکن پرشوق و جوش قاری کو بھولنے بھلانے کا اذنِ عام ہے: وہ اٹھ کر جا سکتا ہے، وفاداری کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے لکھنے والوں سے ملوث ہو سکتا ہے، لوٹ کر آ سکتا ہے، اور بارِ دیگر فن پارے میں محو اور بے خود ہو سکتا ہے۔ خانگی زندگی کو اس رشتے میں مخل ہونے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی؛ یہ رشتہ متفرق الاوقات تو ہو سکتا ہے، لیکن جب بھی وقوع پذیر ہو جائے، ہمیشہ ہی بڑا شدید ہوتا ہے۔ اس میں روزمرہ والا بغض و عناد نہیں ہوتا، جو لوگوں میں ڈھور ڈنگروں کی طرح ساتھ جُتے جُتے زندگی کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو کبھی فلوبیر کو، تھکن سے چور آواز میں، اس یاددہانی کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ بھئی ہاتھ میٹ کو قرینے سے لٹکا دیا ہوتا، یا ٹائلٹ کو بعد از استعمال برش سے صاف کر لیتے۔ لیکن بس یہی ڈاکٹر سارکی کرنے سے باز نہیں رہنے والیں۔ دیکھیے، میں چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، ادیب کامل یا ''بے عیب'' نہیں ہوتے، جس طرح عام زن و شوہر نہیں ہوتے۔ اگر کوئی اصول یقینی ہو سکتا ہے تو وہ بس یہ ہے: اگر ''بے عیب'' نظر آئیں، تب بھی

نہیں ہوتے۔ میں نے اپنی بیوی کو بھی ''بے عیب'' نہیں خیال کیا تھا۔ مجھے اس سے محبت تھی، لیکن میں نے خود کو کسی فریب میں نہیں آنے دیا۔ مجھے یاد آتا ہے... لیکن میں یہ کسی اور موقعے کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

اس کے بدلے مجھے ایک اور لیکچر یاد کرنا چاہیے جس میں میں سامع کی حیثیت سے شریک تھا، چند سال پہلے، چلٹنہم (Cheltenham) کے ادبی میلے میں۔ یہ لیکچر کیمبرج کے ایک پروفیسر صاحب، بنام کرسٹوفر رِکس (Christopher Ricks)، نے دیا تھا۔ یہ ایک بڑی ضیا پاش پرفارمینس تھی: ان کی چندیا بھی چمکدار، کالے کفش پا بھی چمکدار، اور لیکچر بھی، ظاہر ہے، بے حد چمکدار۔ موضوع تھا: ''ادب میں غلطیاں، اور کیا یہ واقعی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں''۔ یوتوشینکو (Yevtushenko)، مثلاً، امریکی بلبلوں کے بارے میں اپنی ایک نظم میں بڑی بھاری غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ رقص کے موقعے پر جو فوجی لباس پہنا جاتا ہے اس کے بارے میں پشکن سے شدید غلطی ہوئی تھی۔ جان وین ہیروشیما پر بم گرانے والے ہواباز کے بارے میں غلط تھا۔ نبکوف (Nabokov) — یا عجب! — لولیتا کے نام کی صوتیات کے بارے میں غلطی پر تھا۔ چند اور مثالیں بھی تھیں: کولرج، کیٹس اور براؤننگ ان میں سے چند تھے جو ''ہاک'' اور ''ہینڈسا'' (hawk and handsaw) کے فرق سے قطعی لاعلمی کے عالم میں پکڑے گئے تھے، یا یہی کہ ''ہینڈسا'' ہوتا کیا بلا ہے۔

دو مثالیں، خاص طور پر، میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئیں۔ پہلی *Lord of the Flies* کے بارے میں بڑی قابلِ لحاظ دریافت تھی۔ اس مشہور منظر میں، جس میں پگی (Piggy) کی عینک آگ کی دریافتِ نو کے واسطے استعمال ہوئی ہے، ولیم گولڈنگ کا علمِ بصریات (optics) بالکل الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ پگی نزدیک بین ہے؛ اس عارضے کے واسطے جس قسم کے عدسوں والی عینک تجویز ہوتی ہے اس سے آگ سلگانے کا کام سرے سے لیا ہی نہیں جا سکتا۔ آپ چاہے جس زاویے سے اسے استعمال کرتے، یہ سورج کی شعاؤں کو ایک نکتے پر شدت کے ساتھ مرتکز کرنے سے عاجز ہی رہتی۔

دوسری مثال کا تعلق ٹینی سن کی "Charge of the Light Brigade" سے تھا۔ "Into

"the valley of Death/Rode the six hundred." ٹینی سن نے یہ نظم بڑی عجلت میں کہی تھی، ''دی ٹائمز'' میں ایک رپورٹ پڑھنے کے بعد، جس میں یہ فقرہ بھی شامل تھا، ''کسی سے بڑی فاش غلطی ہوئی تھی''۔ اس نے ایک سابقہ بیان پر بھی اعتماد کیا، جس میں ''۶۰۷ [خمدار] تلواریں'' مذکور تھیں۔ بہر حال، بعد میں اس معرکے میں — جسے کمیل روسے (Camille Rousset) نے ''یہ بھیانک اور خونین کھائی باڑ گھڑ دوڑ'' ("ceterrble et sanglant steeplechase") کے الفاظ میں بیان کیا ہے — حصہ لینے والوں کی تعداد میں سرکاری طور پر تصحیح کر کے اسے ۶۷۳ مقرر کیا گیا۔ "Into the valley of Death/Rode the six-hundred and seventy-three?" لیکن یہ بھی کہاں بالکل درست ہے۔ خیر، بالکل نہ سہی، کم از کم مقابلتاً زیادہ درست تو ہے! ٹینی سن نے مسئلے پر غور خوض کیا اور نظم میں تبدیلی نہ کرنے ہی کا فیصلہ کیا: ''بحر کے اعتبار سے، چھ سو (جیسا کہ میرا خیال ہے) سات سو سے کہیں زیادہ بہتر ہے؛ چنانچہ برقرار رہنے دو۔''

''چھ سو تہتر'' یا ''سات سو'' یا ''تقریباً سات سو'' کے بجائے ''چھ سو'' کا استعمال میری دانست میں تو کوئی ایسی بات نہیں جسے ''غلطی'' سے متصف کیا جا سکے۔ دوسری طرف، گولڈنگ کے علم بصریات میں جو کپکپاہٹ کا عالم ہے، اسے ضرور ''غلطی'' کی صف میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے: تو کیا اس سے کوئی لمبا چوڑا فرق پڑ جاتا ہے؟ جہاں تک ڈاکٹر رِکس کا لیکچر میرے حافظے میں تازہ ہے، تو ان کا دعویٰ تھا کہ اگر ادب کا امرِ واقعہ پہلو قابلِ اعتماد نہ رہے تو پھر ''طنز'' اور ''فینٹسی'' جیسی فنی حکمت عملیوں سے کام لینا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو یہ نہیں معلوم کہ سچ کیا ہے، یا کیا ہونا چاہیے، تو پھر جو جھوٹ ہے، یا جو ہونا چاہیے، اس کی صحیح قدر و قیمت گھٹ کے رہ جاتی ہے۔ یہ دلیل، کم از کم مجھے تو، بڑی جاندار نظر آتی ہے؛ گو میں یہ سوچنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ادبی سہو کے کتنے مواقع ایسے ہوں گے جن پر اس کا، فی الواقع، اطلاق ہو سکے۔ جہاں تک پگی کے چشمے کا تعلق ہے، تو میرے خیال میں (الف) چشمہ سازوں، معالجینِ چشم، اور چشمہ بردار پروفیسرانِ انگریزی سے قطع نظر، کم ہی لوگوں کی توجہ اس طرف جا سکے گی؛ اور (ب) اگر جائے بھی تو وہ ''غلطی'' کو بے اثر کر دیں گے — جس طرح کسی چھوٹے سے بم کو نگران دھماکے کے ذریعے بے نیش کر دیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ بے نیشی [یا ڈیٹونیشن] کا یہ عمل (جو سمندر کے کسی اجاڑ سے کنارے کی ریت پر وقوع پذیر ہوتا ہے، جہاں گواہ کی

حیثیت سے بس ایک آدھ کتا ہی موجود ہوتو ہو) ناول کے بقیہ اجزا کو آگ نہیں لگا دیتا۔

غلطیاں، مثلاً جیسی کہ گولڈنگ نے کی ہے، ''خارجی غلطیاں'' ہوتی ہیں ــــ اس تفاوت کی زائیدہ ہوتی ہیں جو کسی چیز کے بارے میں کتاب کے دعوے اور حقیقت کے بارے میں ہمارے علم کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر یہ محض اس بات کی دلیل ہوتی ہیں کہ ادیب کسی علم سے متعلق مخصوص فنی معلومات سے نابلد ہے۔ یہ گناہ بالکل قابلِ درگزر ہے۔ لیکن ''داخلی غلطیوں'' کے بارے میں کیا حکم دیا جائے، مثلاً جب ادیب اپنی نگارش میں دو ایسی باتوں کا دعویٰ کرے جو ایک دوسرے کی ضد ہوں اور جن میں کوئی توافق نہ پایا جاتا ہو؟ ایما کی آنکھیں بھوری ہیں، ایما کی آنکھیں نیلی ہیں۔ آہ، یہ صرف نااہلیت ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے، اور ادبی پھوہڑپن کا۔ چند دن پہلے میں نے ایک ناول پڑھا جو ایک ادیب کی پہلی کاوش تھا، اور جس کی خوب تعریف بھی ہوئی تھی۔ اس کا راوی ــــ جو جنسی اعتبار سے ناآزمودہ اور فرانسیسی ادب کا شوقیہ پرستار، دونوں ہی ہے ــــ لڑکی کو جھڑکی کھائے بغیر چومنے کے بہترین طریقے کی پرازمزاح آزمائشی مشق کرتا ہے، ''آہستہ، شہوانی ناقابلِ مدافعت طاقت سے [لڑکی کو] بتدریج اپنی طرف کھینچو اور، دریں اثنا، اس کی آنکھوں میں یوں ڈوب کر دیکھو جیسے ابھی ابھی تمھیں 'مادام بوواری' کے پہلے، اشاعت سے روکے ہوئے ایڈیشن کا ایک نسخہ تحفتاً ملا ہو۔''

مجھے محسوس ہوا کہ بات بڑے سلیقے سے ادا کی گئی تھی، بلکہ یقیناً بڑے پرتفنن طریقے پر۔ لیکن چکر یہ تھا کہ 'مادام بوواری' کے پہلے، اشاعت سے روکے ہوئے ایڈیشن جیسی کسی چیز کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ یہ ناول، جیسا کہ میرے خیال میں کم و بیش سبھی جانتے ہیں، سب سے پہلی بار ''رویو دپاری'' (Review de Paris) میں قسط وار طبع ہوا تھا؛ بعد ازآں اس پر فحاشی کا مقدمہ چلا؛ اور بریت کے بعد کہیں جا کر یہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ میرا گمان ہے کہ نوجوان ناول نگار (ان کا نام ظاہر کرنا سراسر زیادتی ہوگی) شاید 'بدی کے پھول' (*Les Fleurs du Mal*) کے ''پہلے، اشاعت سے روکے ہوئے ایڈیشن'' کا سوچ رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں، اگر اس کی نوبت آئی، وہ غلطی کا بروقت ازالہ کریں گے۔

بھوری آنکھیں، نیلی آنکھیں۔ کیا اس سے واقعی کوئی فرق پڑ جاتا ہے؟ نہیں، اگر ادیب خود اپنی ہی تردید کرے تو اس سے کون سا فرق پڑ جاتا ہے؛ لیکن، کیا اس کی اہمیت ہے کہ آنکھیں کس رنگ کی

ہیں؟ جب ناول نگاروں کو عورتوں کی آنکھوں کے رنگ کا ذکر کرنا پڑ جائے تو مجھے ان پر رحم آتا ہے؛ پسند کے لیے انتخاب اتنا محدود ہوتا ہے اور، انجامِ کار، جس رنگ پر نظر ٹھہرایئے، نہایت پیش پا افتادہ مضمرات کا حامل نکل آتا ہے۔ اس کی آنکھیں نیلی ہیں: معصومیت اور ایمانداری؛ سیاہ ہیں: شہوانیت اور گہرائی؛ سبز ہیں: سرکشی اور حسد؛ بھوری ہیں: اعتبار اور روزمرہ کی فہم وفراست؛ بنفشئی ہیں: ناول ریمنڈ چینڈلر (Raymond Chandler) کا نوشتہ ہے۔ خاتون کے کردار کے بارے میں جملۂ معترضہ کے کسی توشہ دان کے بغیر آپ کی اس تمام چکر سے گلوخلاصی بھلا کہاں ممکن ہے۔ اس کی آنکھیں کیچڑ کے رنگ کی ہیں؛ وہ جو کاسمیٹک لینسز استعمال کرتی ہے تو اس کی آنکھیں اسی حساب سے اپنا رنگ بدل لیتی ہیں؛ اس نے اس کی آنکھوں کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ہاں تو، انتخاب کے لیے جو چاہے چن لیجیے۔ میری بیوی کی آنکھیں سبزی مائل نیلی تھیں، جس سے اس کا قصہ خاصا طولانی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ لکھنے والا، صاف گوئی کے خالص ذاتی لمحات میں، آنکھوں کی تعریف کی مہملیت کا شاید ضرور معترف ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نسوانی کردار کا تصور کرتا ہے، اسے ایک شکل میں ڈھالتا ہے، اور پھر — سب سے آخر میں — ان ویران خانہ ہائے چشم میں کانچ کی آنکھوں کی ایک جوڑی بٹھا دیتا ہے۔ آنکھیں؟ جی ہاں، اس کی آنکھیں تو ہونی ہی چاہئیں، وہ واماندہ تواضع سے سوچتا ہے۔

اپنی ادبی چھان بین کے دوران بووار اور پےکوشے[۲] کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیب غلطی کا مرتکب ہوا نہیں کہ ان کی نظر میں بیچارے کی ساری عزت آبرو جاتی رہی۔ دوسری طرف مجھے اگر تعجب ہے تو اس بات پر کہ ادیب کس قدر کم غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لی ایژ (Liege) کا اسقف جب مرنا چاہیے اس سے پندرہ سال پہلے ہی مر جاتا ہے: تو کیا اس سے ''کوتیں دوروار'' (*Quentin du Rward*) باطل ہو جاتا ہے؟ یہ بڑی معمولی سی بدعنوانی ہے جو تبصرہ نگاروں کی طرف اچھال دی گئی ہے۔ میں ناول نگار کا تصور اس طرح کرتا ہوں کہ وہ [برٹش] چینل پر آمدورفت اور نقل وحمل کی کشتی کے دنبالے میں جنگلے سے لگا کھڑا ہے، اور اپنے سینڈوچ سے چبنی ہڈی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر

۲۔ یہ دونوں فلوبیر کے نامکمل ناول *Bouvard et Pecuchet* کے کردار ہیں۔ اس ناول میں، جو فلوبیر کی وفات کے بعد شائع ہوا، بابوقسم کے نقادوں نے خوب کیڑے نکالے ہیں اور اس میں سائنس سے متعلق پائی جانے والی غلطیوں پر مصنف کا بڑی جارحیت سے مواخذہ کیا ہے۔

سامنے منڈلاتے ہوئے آبی پرندوں کی طرف پھینکتا جا رہا ہے۔

میں اتنی دور بیٹھا تھا کہ اینڈ سٹارکی کی آنکھوں کا رنگ دیکھنے سے قاصر تھا: موصوفہ کے بارے میں مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ انھوں نے ملاحوں[۳] جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے، چال میں سکرم ہاف[۴] کا انداز تھا، اور نہایت بھیانک فرانسیسی لہجے کی مالک تھیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی فرانسیسی ادب کی ریڈر امیریٹس اور سمرول کالج کی آنریری فیلو، جو ''بودلیر، ریمبو، گوئٹے، ایلیٹ، اور ژید جیسے ادیبوں کے سوانح اور فن پاروں پر اپنی مطالعاتی کتابوں کے لیے مشہور تھیں'' (میں یہاں ان کی کتاب کے گرد پوش کے، ظاہر ہے، پہلے ایڈیشن سے اقتباس پیش کر رہا ہوں)، اور جنھوں نے دو ضخیم کتابیں اور اپنے زندگی کے کئی سال ''مادام بوواری'' کے مصنف پر وقف کر رکھے تھے، تو موصوفہ نے پہلی جلد کے فرنٹ پیس کے واسطے ''گستاو فلوبیر، ایک گمنام مصور کے موقلم سے'' نامی پورٹریٹ کا انتخاب کیا۔ یہ سب سے پہلی چیز ہے جس سے ہماری نظریں چار ہوتی ہیں۔ یہ، آپ چاہیں تو، وہ لمحہ ہے جب ڈاکٹر سٹارکی ہمیں فلوبیر سے متعارف کراتی ہیں۔ لیکن بس مصیبت ساری یہ ہے کہ یہ فلوبیر کی نہیں، لوئی بوییے (Louis Bouilhet) کی پورٹریٹ ہے، جیسا کہ کرواسے[۵] کی کوئی بھی ماما[۶] آپ کو بہ آسانی بتا دے گی۔ بغلیں بجانا ختم ہوتے ہی یہ حقیقت منھ تک رہی ہوتی ہے۔ اس کا کیا کیا جائے؟

شاید آپ ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں کہ میں ایک آنجہانی عالمہ کے خلاف مقاومت کا مظاہرہ کر رہا ہوں، اور وہ بھی جو اپنی مدافعت سے معذور ہے۔ ہوسکتا ہے۔ تو پھر رکھوالوں کی رکھوالی کون کرے گا؟[۷]

۳۔ اصل میں matelot کا لفظ استعمال ہوا ہے، جسے sailor کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔ ''ملاح'' بس کام چلاؤ ترجمہ ہے۔

۴۔ scrum-half: رگبی کھیل میں وہ کھلاڑی جو پالے یا فیلڈ کے وسطی خط کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔ عام طور پر ان کے بازو ایک دوسرے میں پروئے ہوتے ہیں اور یہ اپنی گری گری سی ہیئت کذائی میں لجاجت سے پاؤں پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ Croisset: دریائے سین پر رُواں کے نواح میں فلوبیر کی املاک کا نام، جہاں وہ ۱۸۴۶ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد مستقل قیام کے لیے اٹھ آیا تھا۔

۶۔ اصل لفظ gardienne، یعنی ''پاسباں عورت'' ہے۔

۷۔ اصل: Quis custodies ipsos custodes?

ایک اور بات آپ کو بتا تا چلوں: میں نے ابھی ابھی ''مادام بوواری'' دوبارہ پڑھی ہے۔

ایک موقعے پر وہ ایما کی آنکھوں کا رنگ بھورا دکھاتا ہے (۱۴)، ایک اور موقعے پر گہرا سیاہ (۱۵)؛ اور ایک اور موقعے پر نیلا (۱۶)۔

اور اس تمام بھاگ دوڑ سے جو سبق نکلتا ہے وہ، میرے خیال میں، یہ ہے: فٹ نوٹس کا دیدار ہوتے ہی دُم دبا کر بھاگ نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ یہ رہے وہ چھ حوالے جو فلوبیر نے پوری کتاب میں ایما بوواری کی آنکھوں کے بارے میں دیے ہیں:

۱۔ (جب ایما پہلی بار ظاہر ہوتی ہے) ''جہاں تک اس کے حسین ہونے کا تعلق ہے، تو اس حسن کا مرجع اس کی آنکھیں تھیں؛ اگر چہ یہ بھوری تھیں، تاہم اس کی پلکوں کے باعث سیاہ نظر آتی تھیں...''

۲۔ (شادی کے اولین ایام میں؛ اپنے پرستار شوہر کی زبانی) ''اسے اس کی آنکھیں بڑی لگتیں، خاص طور پر اس وقت جب وہ بس ابھی بیدار ہو رہی ہو اور جلدی جلدی اپنے پپوٹے پھڑ پھڑا رہی ہو؛ سائے میں سیاہ اور کھلی روشنی میں یہ گہری نیلی نظر آتیں؛ اور ایسا لگتا جیسے ان میں رنگوں کی تلے اوپر تہیں کی تہیں جمی ہوں، جو نیچے گہرائیوں میں گہرے رنگ کی ہوں اور میناکاری جیسی سطح تک آتے آتے ہلکی پڑ رہی ہوں۔''

۳۔ (لے اوں (Leon) سے پہلی ملاقات ہونے پر) ''وہ اسے بڑی بڑی پوری کھلی ہوئی آنکھوں سے تکنے لگی۔''

۴۔ (موم بتیوں کی روشنی میں ایک رقص کے دوران) ''اس کی سیاہ آنکھیں کچھ اور زیادہ سیاہ نظر آ رہی تھیں۔''

۵۔ (درونِ خانہ، جیسی کہ وہ رودلف (Rodolphe) کو اس وقت نظر آتی ہے جب وہ پہلی بار اس کا معائنہ کر رہا ہوتا ہے) ''اس کی سیاہ آنکھیں۔''

۶۔ (درونِ خانہ، شام کے وقت، جب ایما ابھی ابھی رودلف کی جنسی ترغیب میں آنے کے بعد آئینہ دیکھ رہی ہے) ''اس کی آنکھیں اس سے قبل کبھی اتنی بڑی نہیں تھیں، نہ اتنی سیاہ، نہ ان میں اتنی عمیق گہرائی تھی۔''

ہاں تو نقاد نے کیا کہا تھا؟ ''فلوبیر اپنے کرداروں کی تعمیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح بالزاک کرتا تھا، معروضی اور خارجی بیان کے ذریعے: سچ تو یہ ہے کہ وہ ان کے ظاہری حلیے کے معاملے میں اس قدر بے پروا واقع ہوا ہے کہ... ''فلوبیر نے جو وقت اس بات کا یقین کر لینے پر صرف کیا ہوگا کہ اس کی ہیروئن کی آنکھیں واقعی ایک دردناک زنانیہ کی مشکل پسند آنکھوں ہی کی طرح نظر آئیں، اس کا مقابلہ اس وقت سے کیا جائے جو ڈاکٹر سٹارکی نے فلوبیر کو اس قدر مندے داموں فروخت کرنے پر لگایا ہے، تو یہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اور ہاں، ایک آخری بات اور سہی، پورا اطمینان کر لینے کے لیے۔ فلوبیر کے بارے میں ہماری قدیم ترین مستحکم معلومات کا ماخذ مکسیم دُشاں (Maxime du Champs) کی کتاب ''سووینیر لیتیریر'' (*Souvenirs Literaires*) (مطبوعہ پیرس: ہاشیت، ۳-۱۸۸۲ء) کی دو جلدیں ہیں، جو گپ شپ سے پر، خودنما و خودبین، اپنی صفائی آپ پیش کرنے والی، اور ناقابلِ اعتماد ہونے کے باوجود، تاریخی طور پر ناگزیر ہیں۔ پہلی جلد (جو رمنگٹن اینڈ کمپنی نے لندن سے ۱۸۹۳ء میں شائع کی، اور جس پر مترجم کا نام نہیں دیا گیا) کے صفحہ ۳۰۶ پر دشاں اس عورت کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے جس پر ایما کے کردار کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہ عورت دشاں کے بیان کے مطابق رواں (Rouen) کے نواح میں بون لکور (Bon-Lecours) کے ایک میڈیکل آفیسر کی دوسری بیوی تھی:

یہ دوسری بیوی خوب صورت نہیں تھی؛ کوتاہ قد اور پھیکے سے زرد بالوں والی تھی،

> اور اس کا چہرہ چھائیوں سے اٹا پڑا تھا۔ یہ ڈینگیں مارنے کی عادی تھی، اپنے شوہر کو حقیر گردانتی تھی کیونکہ وہ اس کے خیال میں بے وقوف تھا۔ یہ ایک گول مٹول اور کھلتے رنگ کی عورت تھی، اس کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں پر خوب گوشت چڑھا ہوا تھا، اور اس کی چال نیز عام وضع قطع میں اسی لچک اور لہردار حرکت کا احساس ہوتا تھا جو بام مچھلی کا خاصہ ہے۔ اس کی آواز، اس کے زیریں نارمنڈی کے مخصوص لہجے کے عامیانہ پن کی وجہ سے، ملاعبت اور ملاطفت سے چھلکی پڑتی تھی، اور اس کی آنکھوں میں، جن کے رنگ کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل ہے — سبز، سرمئی یا نیلی، اس کا انحصار روشنی کے انعکاس پر تھا — ، ہمیشہ ہی ایک منت سماجت کا تاثر ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر سٹار کی اس وضاحتی پا ے کے وجود سے بڑے پرسکون طور پر نابلد معلوم ہوتی ہیں۔ القصہ، یہ ایک طرح کا تحکمانہ اغماض ہے، اور وہ بھی ایک ایسے ادیب کے حق میں جس نے، بہ ایں طور و بہ آں طور، ان کے بہت سے گیس کے بل ادا کیے ہوں گے۔ سچ پوچھیں تو بس اس قسم کی باتیں مجھے سخت چراغ پا کر دیتی ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا نا کہ مجھے نقادوں سے کیوں نفرت ہے؟ میں اس تاثر کو بیان کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں جو اس لمحے میری آنکھوں میں تیر رہا ہے؛ لیکن وہ مارے طیش کے کچھ زیادہ ہی بدرنگ ہو چلی ہیں۔

❄

انتساب:

مطہّر علی جیّد کے نام

(مترجم)

عالمی ادب سے انتخاب

میلان کنڈیرا

امین مالوف

لیلیٰ بعلبکّی

الیگزاندر سولژے نیتسن

جولین بارنز

Cover painting: *The Will to Live* by Imelda Pilapil

ISBN: 969-8379-76-2

Rs.90